بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ اقبال اور تقلید و اجتہاد

زیر نگرانی
حضرت مولانا مفتی محمد مکرم محی الدین صاحب حفظہ اللہ
استاذ حدیث و فقہ جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدر آباد

بقلم
مفتی محمد طاہر شاہی قاسمی

علماء دیو بند کے علوم کا پاسبان
دینی و علمی کتابوں کا عظیم مرکز ٹیلیگرام چینل
حنفی کتب خانہ محمد معاذ خان
درس نظامی کیلئے ایک مفید ترین
ٹیلیگرام چینل

Tel: 8050527485
E-mail: mdtahirshahi01@gmail.com

فہرست

۱	تمہید	۴
۲	اجتہاد فقہ اسلامی میں	۶
۳	اجتہاد کے شرائط و مجتہد کے اوصاف	۶
۴	اجتہاد کی اقسام	۸
۵	علامہ اقبال اور اجتہادِ مطلق	۹
۶	مذاہب مدوّنہ سے متعلق علامہ کا نظریہ اور اس کا جائزہ	۹
۷	علامہ کو اجتہاد کی ضرورت محسوس کیوں ہوئی ؟	۱۳
۸	اپنے نظریہ پر بیان کردہ علامہ کے کچھ تائیدات	۱۴
۹	علامہ کے اپنے نظریہ پر بیان کردہ کچھ نکات اور ان کا تجزیہ	۱۶
۱۰	علامہ کے نظریہ اجتہاد پر عمل کی گنجائش بھی ہے؟	۱۹
۱۱	علامہ کا اپنے نظریہ سے متعلق سید سلیمان ندویؒ کو خط	۲۱
۱۲	علامہ سید سلیمان ندویؒ کا موقف	۲۱
۱۳	علامہ اقبال کا نظریہ ’’پارلیمانی اجتہاد‘‘	۲۴
۱۴	نظریۂ اجتہاد پر ہم عصر علماء کی آراء	۲۵
۱۵	نظریۂ پارلیمانی اجتہاد پر سید سلیمان ندویؒ کی رائے	۲۷
۱۶	پارلیمانی اجتہاد سے متعلق شیخ الاسلام مفتی تقی صاحب کی رائے	۲۹
۱۷	اس نظریہ کی ناکامی کے اسباب	۳۰

۱۸	اجتماعی اجتہاد قرون اولیٰ میں اور اب اس کی صورت	۳۱
۱۹	حکیم الامت کے قول سے تائید	۳۶
۲۰	تقلید شرعی اور علامہ اقبال	۳۸
۲۱	تقلید کی ضرورت	۳۸
۲۲	تقلید حضور اور صحابہ کے دور سے ہی رہی ہے	۴۰
۲۳	تقلید کا حکم	۴۱
۲۴	موجودہ دور میں کونسی تقلید واجب اور اس کی مصلحت؟	۴۲
۲۵	تقلید سے متعلق علامہ کا نظریہ	۴۴
۲۶	علامہ کا نظریۂ تقلید در اشعار فارسی و اردو	۴۴
۲۷	علامہ کا نظریۂ تقلید ایک واقعہ سے	۴۵
۲۸	علامہ کے رجوع الی التقلید کی وجہ	۴۷
۲۹	علامہ اقبال اور ائمہ اربعہ کی تقلید	۴۷
۳۰	خاتمۂ کلام	۴۹
۳۱	مراجع	۵۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله حمدًا متوفرًا والصلاة والسلام على رسوله صلاةً متكاثرًا، أما بعد.

اجتہاد وتقلید دونوں نا قابلِ انکار حقیقت ہیں، نہ ہی سرے سے اجتہاد کی اہمیت کا انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تقلید کی ضرورت کا انکار کر سکتے ہیں، دونوں تقاضائے عدل ہے، جب تک اجتہاد کی ضرورت رہی اجتہاد پر عمل ہوا اور جب ضرورت پوری ہوگئی تو بالغ نظر، انصاف پسند علماء نے دین واسلام کی امتیازیت ومرکزیت کو باقی رکھنے اور نصوصِ شرعیہ میں من مانی، تاویل وتحریف پر روک لگانے کے لئے اجتہادِ مطلق کے دروازہ کو بند کر دیا، رہی بات تقلید کی، تو تقلید کی ضرورت تو دورِ اول سے رہی ہے اور قیامت تک رہے گی، کبھی کسی کو تقلید سے مفر نہیں ہے، لہٰذا ضرورت کے ناطے تقلید تو ہمیشہ معمول بہ رہے گی، اگر انسان کو تقلید کے پھندے سے نکال دیا جائے تو اس کو صراط مستقیم پر باقی رکھنا مشکل ہو جائے گا، غیر محسوس طریقہ سے وہ راہِ راست سے بھٹک جائے گا، اپنے آپ کو وہ حق پرست وراہ راست پر گامزن سمجھتا ہوا ہوگا، لیکن در حقیقت وہ راستہ سے بھٹکا ہوا ہوگا، لہٰذا اجتہاد وتقلید سے متعلق افراط وتفریط کا شکار ہوئے بغیر ان کے بارے میں درست رائے قائم کرنا بہت اہمیت کا حامل ہے۔

اجتہاد وتقلید سے متعلق، بہت پہلے سے لوگوں کی آراء مختلف رہی ہیں، کچھ افراط کا شکار ہوئے تو کچھ تفریط کا شکار ہوئے، علامہ اقبال ایک بہت بڑے اسلامی شاعر گذرے ہیں، اللہ نے انہیں اپنے وقت کا بے مثال شاعر بنایا تھا، اللہ نے ایسی صلاحیت دی تھی کہ حضرت کسی عالمِ دین کے سامنے زانوے تلمذ تہ کئے بغیر بھی بہت سے اسلامی دقیق مسائل میں اپنی صحیح رائے قائم کرتے، اسی وجہ سے علامہ موصوف مفکرِ اسلام کے لقب سے بھی جانے جاتے ہیں، جہاں علامہ نے بہت سے مسائل میں اپنا نظریہ قائم کیا تھا وہیں اجتہاد وتقلید پر بھی اپنا نظریہ قائم کیا تھا کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا

رہے گا اور اس پر عمل ہوتا رہے گا، لیکن جب اس بھاری منصب کی عظمت اور اس کے لئے درکار شرائط واوصاف کی نزاکت کا احساس ہوا اور امتِ مسلمہ کی مجموعی صورتِ حال کا باریک بین سے جائزہ لیا تو تقلید کا نظریہ اپنا لیا، اِدھر بعض حامیانِ تجدد، علامہ کے اس فکری انقلاب کو قبول کرنے کے بجائے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگ گئے کہ علامہ اخیر لمحہ تک نظریۂ اجتہاد پر ہی باقی رہے، ہم اس پورے مقالہ میں اس بات کو ثابت وواضح کریں گے کہ علامہ کا نظریہ پہلے کیا تھا اور اخیر دور میں کیا تھا اور یہ بات بھی واضح کریں گے کہ علامہ کے افکار کی روشنی میں اس دور میں اجتہاد وتقلید کا کیا نظریہ رکھنا چاہئے۔

ہم نے اس مقالہ میں تین چیزوں پر بحث کی ہے: (۱) مطلق اجتہاد (۲) مطلق اجتہاد پارلیمان میں (۳) تقلید، یوں تو علامہ اقبال کے نظریہ پر ایسے ہی طائرانہ نظر ڈالیں تو دو ہی نظریہ نظر آتے ہیں، لیکن حقیقی نگاہ ڈالیں گے تو دراصل وہ تین نظریہ بنتے ہیں، اس طرح کے علامہ اقبال (۱) مطلق اجتہاد کے قائل تھے (۲) پھر مطلق اجتہاد کو پارلیمان میں نافذ کرنے کے قائل تھے (۳) تقلید کے قائل تھے، تو ہم نے تینوں حصوں پر بالتفصیل بحث کی ہے اور عمومیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حتی الامکان آسان اردو استعمال کی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ اس ناچیز کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطاء فرمائے، اور اس مقالہ کو مسلمانوں کے حق میں نافع ومفید بنائے، آمین۔

وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب.

احقر
محمد طاہر شاہی قاسمی

علماء دیوبند کے علوم کا پاسبان
دینی وعلمی کتابوں کا عظیم مرکز ٹیلیگرام چینل
حنفی کتب خانہ محمد معاذ خان
درس نظامی کیلئے ایک مفید ترین
ٹیلیگرام چینل

اجتہاد فقہِ اسلامی میں

اجتہاد کی لغوی تعریف مفتی محمد تقی صاحب عثمانی نے یوں کی ہے:

> الاجتهاد في اللغة بذل الجهد لتحصيل أمر من الأمور. (الاجتہاد الجماعی، ص: ۳، مفتی تقی عثمانی صاحب)
>
> کسی بھی کام کو حاصل کرنے کے لئے کوشش صرف کرنا۔

اور اصطلاحی تعریف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:

> حقيقة الاجتهاد على ما يفهم من كلام العلماء استفراغ الجهد في إدراك الأحكام الشرعية الفرعية من أدلتها التفصيلية. (عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص: ۲، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، متوفی ۱۱۷۶ھ، دار الفتح الشارقۃ)
>
> فقہاء کی تشریح سے اجتہاد کی حقیقت وتعریف کچھ اس طرح سمجھ میں آتی ہی کہ کوشش کو صَرف کرنا، ادلّۂ تفصیلیہ سے احکامِ شرعیہ فرعیہ کو مستنبط کرنے میں، یعنی کتاب، سنت، اجماع، قیاس سے۔

امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

> بذل المجتهد وسعه في طلب العلم بأحكام الشريعة. (الاجتہاد الجماعی، ص: ۳، مفتی تقی صاحب عثمانی)
>
> مجتہد کا احکام شرعیہ کا علم حاصل کرنے میں اپنی کوشش کو صرف کرنا۔

اجتہاد کے شرائط ومجتہد کے اوصاف

چوتھی صدی، سے پہلے پہلے تک زمانہ کچھ اس طرح تھا کہ لوگوں میں خواہش پرستی کے بالمقابل اتباعِ شریعت کا زیادہ غلبہ تھا، جس کی بنیاد پر اُس زمانہ میں اجتہاد ومجتہد کے لئے کچھ شرائط متعین نہیں تھے، لیکن جب اس کے بعد کا زمانہ ایسا آیا کہ خواہش پرستی بڑھ گئی، خواہش پرست حضرات کا اپنے خواہش کے مطابق قرآن وسنت سے احکام مستنبط کر لینے کا اندیشہ وخدشہ ہونے لگا تو ائمہ ومجتہدین نے دین کی حفاظت اور شریعت کے امتیاز کو باقی رکھنے کی خاطر اجتہاد ومجتہد کے کچھ شرائط واوصاف متعین کردئے، جس پر سب کا اتفاق اور اجماع ہوگیا، لہٰذا یہ شرائط واوصاف جن میں پائیں جائیں گے وہی اجتہاد کے اہل مانے جائیں گے، ائمہ ومجتہدین کے متعین کردہ شرائط کچھ اس طرح ہیں: علامہ بغویؒ لکھتے ہیں:

> والمجتهد من جمع خمسة أنواع من العلم: علم كتاب الله، وعلم سنة رسول الله، وأقاويل علماء السلف من إجماعهم واختلافهم، وعلم اللغة، وعلم القياس وهو طريق استنباط الحكم من الكتاب والسنة إذا لم يجده صريحا في نص كتاب أو سنة أو إجماع. (شرح السنۃ للبغوی: ۱۰/۱۲۰، ب اجتہاد الحاکم، ابومحمد الحسین البغوی، متوفی ۵۱۶ھ، المکتبۃ الاسلامی، دمشق ۱۴۰۳ھ)
>
> مجتہد وہ ہے جو اپنے اندر پانچ طرح کا علم رکھتا ہوع (۱) کتاب اللہ کا تفصیلی علم، یعنی جو آیات احکام ومسائل سے متعلق ہیں ان کا علم ہو، (۲) سنتِ رسول ﷺ کا تفصیلی علم، یعنی ان احادیث کا علم ہو جو احکام سے متعلق ہیں، (۳) علماءِ سلف کے اجماعی واختلافی اقوال سے باخبر ہو، (۴) لغت یعنی عربی میں ماہر ہو، (۵) قیاس کا علم ہو، یعنی کسی مسئلہ میں کتاب وسنت واجماع سے نصِ صریح نہ پائے تو مسئلہ کیسے حل کریں اس کا طریقہ جانتا ہو۔

''مأۃ دروس'' نامی کتاب میں اجتہاد کے شرائط کچھ اس طرح ہیں:

> وشرط الاجتهاد العلم بالفقه وتفسير آيات الأحكام وأخبارها واللغة والتاريخ والملكة الراسخة للاستنباط وانقطع بعد مأة

الــرابــعة. (مأة دروس بحوالہ اجتہاد وتقلید کا آخری فیصلہ، ص: ۴۱، حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ، متوفی ۱۳۶۲ھ، ادارہ افادات اشرفیہ لکھنؤ ۱۴۳۵ھ)

اجتہاد کی شرطیں (جن کے بغیر آدمی مجتہد نہیں بن سکتا) یہ ہیں (۱) فقہ کا علم، (۲) پورے قرآن پاک میں احکام ومسائل سے متعلق جتنی آیتیں ہیں ان سب کی تفسیر یعنی تفصیلی وتحقیقی علم حاصل ہو، (۳) اسی طرح تمام وہ حدیثیں جو احکام ومسائل سے تعلق رکھتی ہیں ان کا علم ہو، (۴) لغت کا علم ہو یعنی عربی زبان میں پوری مہارت ہو، (۵) تاریخ کا علم (جس سے ناسخ ومنسوخ کا علم ہو سکے)، (۶) دلائلِ شرعیہ سے استخراجِ احکام کا ملکہ حاصل ہو۔

اجتہاد کی اقسام

فقہاء نے اجتہاد ومجتہدین کی علی اختلاف الاقوال تین یا چار قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) **مجتہد مطلق:** اس قسم کے تحت آنے والے حضرات وہ ہیں جنہوں نے شریعت میں اجتہاد کیا ہے، اصولِ فقہ کے قواعد کی بنیاد رکھی ہے اور اصول وفروع میں کسی کی تقلید کئے بغیر ادلۂ اربعہ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس سے فروعی احکام مستنبط کئے ہیں۔

(۲) **مجتہد فی المذہب:** وہ حضرات ہیں جو اپنے استاذ کے مقرر کردہ اصول وضوابط کی روشنی میں ادلۂ اربعہ سے احکام مستنبط کرنے پر پوری طرح قادر ہوتے ہیں، یہ حضرات بعض جزئیات میں اپنے امام کی مخالفت بھی کر لیتے ہیں۔

(۳) **مجتہد فی المسائل:** جن جزئیات میں امام سے یا ان کے تلامذہ سے کوئی روایت منقول نہیں، اپنے اجتہاد سے ان کے احکام بیان کرتے ہیں، یہ حضرات اپنے امام کی نہ اصول میں مخالفت کر سکتے ہیں نہ فروع میں۔

(۴) **مجتہد فی التطبیق:** اپنے امام کے اصول کو اچھی طرح محفوظ رکھنے اور مختلف نظائر وامثال پر گہری نظر ہونے کی وجہ سے یہ حضرات اس بات پر قادر ہوتے ہیں کہ امام سے یا ان کے شاگردسے منقول قولِ مجمل ومحتمل کی تفصیل کر سکیں۔

نوٹ: بعضوں نے اس چوتھی قسم کو اقسامِ اجتہاد میں شمار نہیں کیا ہے، جیسے علامہ شامیؒ وغیرہ۔ (معالم اصول الفقہ عند اهل السنة والجماعة: ۱/۴۶۳، باب المبحث الاول الاجتهاد، محمد بن حسين بن حسن الجيزاني، دار ابن الجوزي

۱۴۲۷ھ۔ اجتہاد وتقلید، ص: ۴۶، حکیم الاسلام قاری طیب صاحبؒ، مکتبہ حجۃ الاسلام اکیڈمی دار العلوم وقف ۱۴۳۵ھ)

علامہ اقبال اور اجتہادِ مطلق

علامہ اقبال جب اجتہاد کے قائل تھے تو اجتہاد کی اصطلاحی تعریف کچھ اس طرح بیان کرتے تھے جو عام فقہاء کی بیان کردہ اصطلاحی تعریف سے ہٹ کر تھی، علامہ کے الفاظ یہ ہیں:

> لغوی اعتبار سے تو اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا، لیکن فقہِ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لئے کی جائے۔ (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص: ۲۲۸، سید نذیر نیازی، اسلامک بک سینٹر دہلی، ۱۹۸۶ء)

علامہ نے اپنی بیان کردہ اس تعریف میں اہلِ اصول کے روایتی طرز کی پابندی نہیں کی بلکہ اپنی سوچ وفہم کے مطابق اس کو تعبیر کیا۔

یہاں یہ بات قابلِ تحقیق ہے، کہ علامہ کس اجتہاد کے قائل تھے؟ اجتہادِ مطلق کے یا اجتہاد فی المذہب یا اجتہاد فی المسائل کے؟ تو اس سوال کا حل ہمیں علامہ کے مکتوبات سے ملتا ہے، کہ علامہ مطلق اجتہاد کے قائل تھے، یعنی آج بھی نئے قواعد واصول وضع کئے جاسکتے ہیں جن کے ذریعہ زمانہ کے نئے نئے مسائل حل کرسکیں، علامہ اجتہاد کے تین درجہ کو بیان کرتے ہوئے اخیر میں خود اپنے نظریہ کو واضح کرتے ہیں:

> مشہور مذاہب کے نزدیک اجتہاد کے تین درجہ ہیں: (۱) تشریح یا قانون سازی میں مکمل آزادی، لیکن جس سے عملاً صرف مؤسسینِ مذاہب نے ہی فائدہ اٹھایا، (۲) محدود آزادی جو کسی مخصوص مذہبِ فقہ کی حدود کے اندر ہی استعمال کی جاسکتی ہے، (۳) وہ مخصوص آزادی جس کا تعلق کسی ایسے مسئلہ میں ؟ جسے مؤسسینِ مذاہب نے جوں کا توں چھوڑ دیا ہو،... مگر ہم اس خطبہ میں اپنا دائرۂ بحث اجتہاد کی شقِ اول تک ہی محدود رکھیں گے، یعنی قانون سازی میں کامل آزادی تک، اس میں کوئی شک نہیں کہ نظری طور پر اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص: ۲۲۹، سید نذیر نیازی،

اسلامک بک سینٹر دہلی، ۱۹۸۶ء)

اس اقتباس کے اخیر جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ جب اجتہاد کے قائل تھے تو انکا نظریہ مطلق اجتہاد کا تھا، گویا علامہ کی خواہش تھی کہ جیسے چوتھی صدی تک مطلق اجتہاد کا دروازہ کھلا تھا، اس کے بعد بھی کھلا رہنا چاہئے۔

مذاہب مدوّنہ سے متعلق علامہ کا نظریہ اور اس کا جائزہ

جب ہم یہ بات سنتے ہیں کہ علامہ اقبال مطلق اجتہاد کی بات کرتے تھے تو ذہنوں میں ایک بات آتی ہے کہ پھر تو علامہ کی رائے مدوّنہ مذاہب سے متعلق کچھ الگ ہوگی، کیوں کہ پوری امت کی طرح مدوّنہ مذاہب کو حرفِ اخیر بھی مانیں اور اجتہاد کی ضرورت کی بھی بات کریں یہ ممکن نہیں ہے، واقعہ یہی ہے کہ اس مسئلہ میں علامہ کی رائے پوری امت کی رائے سے کچھ الگ ہی تھی، کچھ مختلف تھی، جس کو وہ اپنے خطبہ میں واضح کرتے ہیں:

> جب ہم اُن اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں جس پر قرآنِ مجید نے قانون کی بنا اٹھائی ہے تو صاف ہو جاتا ہے کہ ان سے نہ تو فکرِ انسانی پر کوئی روک قائم ہوتی ہے، نہ وضعِ آئین وقوانین پر، برعکس اس کے ان میں جو وسعت، رواداری اور گنجائش موجود ہے اس سے ہمارے غور وفکر کو اور بھی تحریک ہوتی ہے...لیکن اس ساری جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود ہمارے نظاماتِ فقہ بالآخر افراد ہی کی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہے، اور اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان پر قانون کے نشو ونما کا خاتمہ ہو چکا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ علماءِ اسلام نے تو مذاہبِ فقہ کے بارے میں کچھ ایسی ہی رائے قائم کر رکھی ہے، مگر پھر بھی اس کے باوجود انہوں نے اجتہاد کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا...کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مذاہبِ فقہ کی خاتمیت پر برابر اصرار کرتے رہنا چاہئے، کیا ائمۂ مذاہب کا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور تعبیرات حرفِ اخیر ہیں؟ ہرگز نہیں، اندریں صورت مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعویدار ہے کہ اسے اپنے تجربات، علی ھذا، زندگی کے بدلتے ہوئے احوال وظروف کے پیشِ نظر فقہ وقانون کے بنیادی اصولوں کی از سرِ نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے، تو میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو، قرآن پاک کا ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے، بجائے خود اس امر کا

> مقتضٰی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کے رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کریں، یہ نہیں کہ اسے اپنے لئے ایک روک تصور کریں۔ (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص: ۲۶۰، سید نذیر نیازی، اسلامک بک سینٹر دہلی، ۱۹۸۶ء)

اس پورے اقتباس میں علامہ نے مدوّنہ مذاہب سے متعلق اپنی رائے واضح کر دی کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق فکرِ انسانی پر کوئی روک نہیں ہے (چوتھی صدی سے قبل تک جس طرح فکر واجتہاد کی آزادی تھی اُس کے بعد بھی آزاد رہے گی) اور یہ نظاماتِ فقہ (مدوّنہ مذاہبِ اربعہ) کوئی آسمانی صحائف نہیں، بلکہ انسانی تعبیرات اور انسانی کاوش کا نتیجہ ہیں، لہٰذا ان مذاہب پر قانون کا نشو ونما ختم ہو جائے یہ ممکن نہیں ہے، ان مذاہب کے بعد بھی قانون کا نشو ونما ہو سکتا ہے، ہونا چاہئے، ساتھ ہی ساتھ علامہ نے یہ بھی واضح کیا کہ پوری امت جو یہ سمجھ رہی ہے کہ مدوّنہ مذاہب حرفِ اخیر ہیں، ایسی بات نہیں ہے، ہاں قابلِ استفادہ ضرور ہیں۔

واضح ہو کہ علامہ کا یہ نظریہ پہلے کا ہے، لیکن جب علامہ نے نظریۂ تقلید کی طرف مراجعت کر لی تو مدوّنہ مذاہب سے متعلق نظریہ کی بھی تبدیلی کر لی، اخیر دور میں علامہ کا یہ نظریہ نہیں رہا جس کو ہم اخیر میں بیان کریں گے، لیکن آج بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو علامہ کے مرجوع عنہ نظریہ کا حوالہ دے کر مدوّنہ مذاہب سے متعلق اسی نظریہ پر باقی ہیں، اس موقع سے قل الحق وإن كان مراً کے تحت کچھ باتوں کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں، علامہ نے مذکورہ اقتباس میں ایک بات کہی تھی کہ قرآنی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ فکرِ انسانی آزاد ہے، واقعتاً علامہ کی بات صحیح ہے، قرآن کی کچھ آیات سے معلوم بھی ہوتا ہے، لیکن ہمارا یہ دور خیر القرون کا نہیں بلکہ خیر القرون سے صدیوں دور کا ہے، خواہش پرستی جتنی عام وغالب ہے، ظاہر ہے۔ اگر ہم ایسے ماحول میں مدوّنہ مذاہب کا پابند بنائے بغیر فکرِ انسانی کو آزاد چھوڑ دیں تو دین مذاق بن جائے گا، اسلام کی امتیازیت ختم ہو جائے گی، اس لئے انسان کو پابند بنانا ضروری سمجھا گیا، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

> إعلم أن في الأخذ بهذه المذاهب الأربعة مصلحة عظيمة، وفي الإعراض عنها كلها مفسدة كبيرة. (عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص: ۴۰، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، متوفی ۱۱۷۶ھ، دار الفتح الشارقہ)
>
> جان لو کہ ان چار مذاہب کو تھامے رہنے میں ہی عظیم مصلحت ہے، اس سے

اعراض کی صورت میں بڑا فساد ہوگا۔

دوسری بات علامہ نے یہ کہی تھی کہ یہ مذاہبِ اربعہ انسانی کاوش کا ہی نتیجہ ہے، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان پر قانون کی نشو ونما کا خاتمہ ہو چکا ہے، یہاں ادب سے عرض ہے کہ قانون کے نشو ونما کی اگر واقعی ضرورت ہو تو اس سے انکار نہیں، لیکن اس دور میں تو ضرورت ہی نہیں رہی، کیوں کہ فقہاءِ متقدمین نے دین کا کوئی شعبہ چھوڑا ہی نہیں کہ اس میں غور وفکر کرسکیں، ہر ممکن صورت کو انھوں نے گھیر لیا ہے، ایسے میں قانون کی نشو ونما کی بات کرنا بے ضرورت ہے، ائمہ احناف میں سے صاحبین کا نیا مذہب نہ اپنانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ ابن منیرؒ لکھتے ہیں:

> اما كونهم ملتزمين، ان لا يحدثوا مذهبا، فلان احداث مذهب زائد بحيث يكون لفروعه أصول وقواعد مبانية لسائر قواعد المتقدمين فمتعذر الوجود، لاستيعاب المتقدمين سائر الأساليب. (رسم المفتی، ص: ۱۳۴، ابن عابدین، متوفی ۱۲۵۲ھ، مکتبہ زکریا دیوبند ۱۴۲۱ھ)
>
> صاحبین کا اجتہادی صلاحیت رکھنے کے باوجود اپنے امام کی تقلید کو لازم کرلینا اس وجہ سے تھا کہ ان کا اجتہاد پر عمل کرتے ہوئے کوئی ایسا نیا مذہب شروع کرنا جس کی جملہ فروعات کے لئے ایسے اصول وقواعد ہوں جو متقدمین کے اصولوں سے علیحدہ ہوں تقریباً ناممکن ہے، کیوں کہ متقدمین نے تمام ممکن صورتوں کا احاطہ کرلیا ہے۔

غرض ائمہ مذاہب نے ہر ممکن صورت کا احاطہ کر کے ایسے قواعد واصول مقرر کردیا ہے کہ پیش آنے والے ہر نئے مسئلہ کو بآسانی حل کرلیا جائے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے فقہاء یہ بات کہنے پر مجبور ہوگئے کہ مذاہبِ اربعہ کی تدوین کے بعد نئی تدوین کی ضرورت نہیں رہی، حق تو انہی چار مذاہب میں منحصر ہو چکا ہے، انہی کو اپنانے میں مصلحت ہے، ابن تیمیہؒ ان چار مذاہب سے متعلق لکھتے ہیں:

> بلاشبہ حق ان مذاہب سے خارج نہیں، کیوں کہ یہی حضرات رہنما ہیں، اس امت کے اربابِ مذاہب ہیں، بلند مرتبہ، سردار، اور قیادت کرنے والے علماءِ دین دیانت دار واضح اجتہاد والے ہیں، لہٰذا کسی مسلمان کے لئے یہ حق نہیں کہ وہ ان کے مذاہب سے عدول کرے، کیوں کہ حق کا جتنا بھی دائرہ ہے وہ ان چار مذاہب

میں منحصر ہو چکا ہے۔ (نقض المنطق، ص: ۱۴۶، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، متوفی ۷۲۸ھ، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ ۱۳۷۰ھ)

اسی طرح مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ان چار مذاہب سے متعلق لکھتے ہیں:

ان چار مذاہب کے دائرہ میں رہنے میں ہی بڑی مصلحت ہے، ان سے عدول کی صورت میں بہت بڑا فساد لازم آئے گا، کیوں کہ زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، امانت کی وہ پاسداری نہیں رہی جو کہ چوتھی صدی تک تھی، آج کسی عالم سے یہ امید نہیں کہ وہ جو بھی سوچے صحیح سوچے اور صحیح سمجھے، اور اُس میں اجتہاد کی شرائط بھی جمع ہوں، آج کے لوگوں میں اجتہاد کی شرائط جمع نہیں ہوسکتی، جس میں اجتہاد کی شرائط موجود نہیں، اس کے اقوال وقواعد پر اعتماد جائز نہیں، لہٰذا خلاصہ یہی نکلے گا کہ مذاہبِ اربعہ کو حرف اخیر سمجھیں اور ان کے حدود میں رہیں، عبارت ملاحظہ ہو:

إعلم أن في الأخذ بهذه المذاهب الأربعة مصلحة عظيمة، وفي الإعراض عنها كلها مفسدة كبيرة ونحن نبين ذلك بوجوه... وثالثها أن الزمان لما طال وبعد العهد وضيعت الأمانة لم يجز أن يعتمد على أقوال علماء السوء ... ولا على قول من لا ندرى هل جمع شروط الاجتهاد أو لا، فإذا رأينا العلماء المحققين في مذاهب السلف عسى أن يصدقوا فى تخريجاتهم على أقوالهم واستنباطهم من الكتاب والسنة ... وهذا المعنى الذي أشار إليه ابن مسعود حيث قال من كان متبعا فليتبع من مضى. (عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص: ۴۰، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، متوفی ۱۱۷۶ھ، دار الفتح الشارقہ)

بس اگر انصاف کی بات کی جائے تو یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ علامہ کا یہ نظریہ قابلِ رجوع تھا، یہی وجہ تھی کہ علامہ نے اخیر دور میں اپنے اس نظریہ سے رجوع کرلیا، ہم اس کو آگے بیان کریں گے۔

علامہ کو اجتہاد کی ضرورت محسوس کیوں ہوئی؟

علامہ کی لکھی ہوئی کتابوں کو اور ان پر لکھی گئی کتابوں کو پڑھنے سے وجہ اور بنیاد کچھ اس طرح کی سمجھ میں آتی ہے

کہ علامہ کو اُن دنوں لوگوں پر صدیوں سے طاری جمود (ہر حال میں تقلیدِ مذاہبِ اربعہ) سے سخت نفرت ہوگئی تھی، چوں کہ علامہ دنیا دیکھ رہے تھے، دنیا آگے بڑھ رہی ہے، اور مسلمان جمود کا شکار ہو کر پیچھے کا پیچھا ہی ہے، تو علامہ نے چاہا کہ مسلمانوں کو آگے بڑھنا چاہئے، ترقی کرنا چاہئے، اور ترقی اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ اس جمود کو ختم نہ کیا جائے، زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، تو مسائل بھی کچھ نئے ہیں، جن کے لئے قواعد بھی نئے ہونے چاہئے، پرانے وضع کردہ قواعد سے یہ مسائل حل نہیں ہوں گے، اور قواعد کو وضع کرنے کے لئے اجتہاد کرنا پڑے گا، اس طرح علامہ نے اجتہاد کی ضرورت کو محسوس کیا اور بنیادی طور پر تُرک کو نمونہ و بنیاد بنایا کہ جس طرح اہل تُرک اجتہاد کر کے، جمود کو ختم کر کے ترقی کر رہے ہیں ہمیں بھی کرنا پڑے گا، علامہ لکھتے ہیں:

> دراصل یہ صرف تُرک ہیں جو اُمم اسلامیہ میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدا ہو کر شعورِ ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں، یہ صرف تُرک ہیں جنہوں نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور جو ایک خیالی دنیا سے نکل کر اب عالمِ حقیقت میں آگئے ہیں... یہ شاید انگریز فلسفی ھابس تھا جس نے یہ نہایت ہی پتے کی بات کہی ہے کہ ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات کے تسلسل کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے کوئی خیالات اور احساسات ہی نہیں، چنانچہ بلادِ اسلامیہ کی اکثریت کو دیکھے تو اس پر یہ قول حرف بحرف صادق آجاتا ہے، ان میں پرانی قدروں ہی کا تکرار جاری ہے... تُرک البتہ نئی نئی قدریں پیدا کر رہی ہیں، ان کا گذر بڑے بڑے اہم تجربات سے ہو رہا ہے اور یہی تجربات ہیں جن سے ان کا اندرونِ ذات ان پر منکشف ہو رہا ہے، ان کی زندگی میں حرکت پیدا ہوگئی ہے وہ بدل رہی ہے اور وسعت حاصل کر رہی ہے، اس کا نتیجہ ہے، نئی نئی آرزوئیں اور نئی نئی مشکلات، مگر پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کے نئے نئے حل بھی سمجھا رہی ہے، لہٰذا آج جو مسئلہ تُرکوں کو درپیش ہے، کل دوسرے بلاد اسلامیہ کو پیش آنے والا ہے، اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کیا فی الواقع مزید نشو و نما اور ارتقاء کی گنجائش ہے، لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا، گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص: ۲۵۰، سید نذیر نیازی، اسلامک بک سینٹر دہلی، ۱۹۸۶ء)

قارئین کرام، علامہ کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ علامہ نے اس نظریہ کو اختیار کرنے میں اہل ترک کو نمونہ بنایا تھا کہ جب تک ان کی طرح ہم بھی جمود کو ختم کر کے آزاد رائے نہیں اپنائیں گے، زمانے کے نئے نئے مسائل

حل نہیں ہو پائیں گے اور ہم ان کی طرح ترقی نہیں کر پائیں گے۔

اپنے نظریہ پر بیان کردہ علامہ کے کچھ تائیدات

ظاہری بات ہے کہ ہر آدمی اپنے بات کو دلیل وتائید سے منور کرنا چاہتا ہے، تاکہ جو پڑھے آسانی سے قبول کرے، شاید علامہ کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ اتنی آسانی سے امت میرے اس نظریہ کو قبول نہیں کرے گی، لہٰذا ان کو خیال آیا کہ اس کو سمجھانے کے لئے ایک دو تائید ایک دو مثالیں دینی ضروری ہوں گی تو اس اعتبار سے علامہ نے کچھ تائیدات سے اپنے اس نظریہ کو منور کرنے کی کوشش کی ہے، سب سے پہلے علامہ نے ابن تیمیہؒ کی نظیر پیش کی کہ صدیوں کے ذہنی جمود کے بعد امام ابن تیمیہ پہلے وہ شخص تھے جنہوں نے اس مہلک اصول یعنی تقلید کے خلاف آواز بلند کی تھی، انہوں نے تمام فقہی مسائل میں کتاب وسنت کی بلاواسطہ رہنمائی کی طرف لوگوں کو دعوت دی تھی، اور اپنے دور کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے نئے نقطۂ نگاہ کی تشریح کی تھی، اُس مردِ مومن نے تمام مخالفتوں اور مصیبتوں کے باوجود ائمہ سلف کے طریقوں کو صدیوں کے انبار تلے سے نکالا تھا، اور قوم کو مشعلِ امید دکھائی تھی، علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں نجد کے ریگستانوں میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک دراصل امام ابن تیمیہ کے تجدیدی کارناموں ہی کی صدائے بازگشت تھی، محمد بن عبدالوہاب کی اس تحریک کو درحقیقت مسلمانوں کے دورِانحطاط کا خاتمہ سمجھنا چاہئے، کیوں کہ اسی تحریک کے باعث اسلام کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اس کے باعث ہر اسلامی ملک میں نئے حالات کا جائزہ لیا جانے لگا، ذہنی الجھاؤ جو صدیوں کے جمود اور تقلید سے پیدا ہو چکے تھے صاف ہونے لگے۔ (تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ، ص: ٢٣٣، سید نذیر نیازی، اسلامک بک سینٹر دہلی، ١٩٨٦ء)

جس دور میں علامہ نے نظریۂ اجتہاد کو اختیا کیا تھا اُس دور میں یہ قضیہ بیان کر کے علامہ یہ بتلانا چاہتے تھے کہ میرا نظریہ کوئی انوکھا اور اجنبی نہیں ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً اس کو اختیار کیا گیا، اس کی ضرورت محسوس کی گئی، بس عمل نہیں ہوا ہے، اور جب بھی عمل ہوا ہے، تب امت کو بہت بڑا فائدہ ہوا ہے، لہٰذا آج بھی عمل ہونا چاہئے۔

علامہ اقبالؒ امام سیوطیؒ کو بھی اپنے خیالات کا ہمنوا قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایسے ہی سولہویں صدی میں سیوطیؒ نے بھی آزادئ اجتہاد کا دعویٰ کیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی دعویٰ کیا کہ ہر صدی کے آغاز پر ایک مجدّد کا ظہور ہوتا ہے۔ (ایضا، ص: ٢٣٥)

علامہ نے اپنے نظریہ کی توثیق میں جرمنی کے ایک پروفیسر ہارٹن کا قول بھی نقل کیا ہے:

> جرمنی کی بون یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر، ہارٹن نے اسلامی فلسفے اور الٰہیات کے حوالے سے بالکل اسی قسم کا سوال اٹھایا ہے، مسلمان مفکرین کے خالصتاً مذہبی افکار کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اسلامی تاریخ

> کی یوں تشریح کی جاسکتی ہے کہ یہ دو الگ الگ قوتوں یعنی ایک طرف آریائی علم وثقافت اور دوسری طرف سامی مذہب کے درمیان بتدریج توافق، ہم آہنگی اور تعاون سے عبارت ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے مذہبی زاویۂ نگاہ کو اس ثقافت کے اجزائے ترکیبی سے ہم آہنگ رکھا ہے، جو اس کے اردگرد پھیلے ہوئے لوگوں میں موجود رہے ہیں، پروفیسر ہارٹن کے بقول آٹھ سو سے گیارہ سو عیسوی تک مسلم الہیات کے کم از کم ایک سو سے زیادہ نظام ہائے فکر مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ (تجدیدِ فکریات اسلام، ص: ۱۹۶، ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکیڈمی، پاکستان ۲۰۰۲ء)

اس طرح کے کچھ نظائر و تائیدات کے مل جانے کی وجہ سے اپنے وقت میں جب اجتہاد کی ضرورت کو محسوس کیا تو خود بھی آزادئ اجتہاد کا نظریہ اپنا لیا تھا، پھر اخیر دور میں جب علامہ پر بات واضح ہوگئی تو علامہ نے نظریہ کو بدل لیا، جب علامہ خود بدل لئے ہیں تو اب پیش کردہ تائیدات کی توجیہ وجوابات ہمارے ذمہ نہیں، بلکہ علامہ کے رجوع کرنے میں ہی جواب مضمر و موجود ہے۔

علامہ کے اپنے نظریہ پر بیان کردہ کچھ نکات اور ان کا تجزیہ

علامہ اقبال نے اپنے نظریہ کو کہیں تو قرآن کی آیت سے مدلّل ومبرھن کیا جیسے علامہ کا قول: کہ

> فقہِ اسلامی کی کی اصطلاح میں اس (مطلق اجتہاد) کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لئے کی جائے اور جس کی بنا جیسا کہ میں سمجھتا ہوں شاید قرآن مجید کی اس آیت —الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا— پر ہے۔ (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص: ۲۲۸، سید نذیر نیازی، اسلامک بک سینٹر دہلی، ۱۹۸۶ء)

اور کہیں اپنے نظریۂ اجتہاد کو حدیثِ نبویؐ سے مدلل ومنور کیا جیسے علامہ کا قول:

> پھر حضور رسالت مآبؐ کی ایک حدیث سے اس (اجتہاد) کا مطلب اور زیادہ وضاحت سے متعین ہوجاتا ہے، چنانچہ روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت معاذؓ کو یمن کا عامل مقرر کیا تو فرمایا معاملات کا فیصلہ کیسے کروگے؟ انہوں نے کہا کتاب

> اللہ کے مطابق، لیکن اگر کتاب اللہ نے ان میں تمہاری رہنمائی نہیں کی تو پھر؟ اللہ کے رسولؐ کی سنت کے مطابق، لیکن اگر سنتِ رسول بھی ناکافی ٹھہری تو؟ اس پر معاذؓ نے کہا تو پھر میں خود ہی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ (حوالہ سابق)

اور کہیں متقدمین کی تائیدات ونظائر سے (جیسا کہ ابھی گذرا) مدلل ومنور کیا، اس کے علاوہ علامہ اقبال نے چندنکات کے ذریعہ بھی اپنے نظریہ کو مدلل کیا تھا۔

پہلا نکتہ کچھ اس طرح بیان کیا تھا، کہ ابتدائی دور سے عباسیہ کے عہد تک سوائے قرآن حکیم کے اسلام کا کوئی لکھا ہوا قانون، اصول، قاعدہ عملاً موجود نہ تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیش آمدہ تمام مسائل کو ہر ایک اپنے اپنے اجتہاد کے ذریعہ قرآن سے حل کر لیتے، سنت سے حل کر لیتے جب ابتدائی دور سے لے کر عباسیہ کے دور تک اجتہاد کا دروازہ کھلا تھا، مسائل کو اجتہاد سے حل کیا جاتا تھا تو آج بھی اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہئے، قرآن کریم اور سنتِ رسول کے دئے ہوئے اس آزادی اور اختیار کے ذریعہ نئے نئے مسائل کو حل کرنا چاہئے، اور اس پر عمل پیرا اسی وقت ہوسکیں گے جب حقِّ اجتہاد کو دوبارہ ثابت کریں اور اس کے بند دروازہ کو کھولیں۔ (تجدید فکریاتِ اسلام، ص: ۱۹۸، ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکیڈمی، پاکستان ۲۰۰۲ء)

علامہ اقبال نے دوسرا نکتہ یہ بیان کیا تھا کہ پہلی صدی کے نصف سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک اسلام میں فقہ وقانون کے قریب قریب اُنیس مکاتبِ فکر کا ظہور ہوا تھا، صرف یہی حقیقت کافی ہے، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ تہذیب وتمدن کی بڑھتی ہوئی ضروریات سے نمٹنے کے لئے ہمارے دورِاول کے فقہاء کس طرح آزادیٔ فکر سے کام لیتے تھے، فتوحات کی توسیع کے ساتھ ساتھ نتیجۃً اسلام کے نقطۂ نظر (آزادیٔ اجتہاد) میں بھی وسعت آگئی تھی، جب دورِاول میں اجتہاد پر عمل کیا جاتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ انیس مکاتب فکر بنے، تو آج اس پر عمل کیوں نہیں ہوسکتا، اس نکتہ کے مطابق تو آج بھی اس پر عمل ہونا چاہئے، تبھی تو امت پر طاری یہ جمود ختم ہوسکتا ہے، اسلام کی نئی تشکیل ہوسکتی ہے، حال ومستقبل کے دونوں مسائل آسانی سے حل ہوسکتے ہیں۔ (حوالۂ سابق)

تیسرا نکتہ یہ بیان کیا کرتے تھے کہ جب ہم اسلامی مآخذِ اربعہ کا مطالعہ کرتے ہیں یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس کا، تو ہمارے فقہی مذاہب کا مفروضہ جمود کا معاملہ اور اجتہاد کے مزید امکانات اور ارتقاء کا معاملہ واضح ہوجاتا ہے، یعنی آج بھی اس بات کی گنجائش رہے گی، کہ آزادیٔ اجتہاد سے کام لے کر نئے مسائل کو نئے قواعد

سے حل کریں۔ (حوالۂ سابق)

علامہ کے بیان کردہ نکات کو قیدِ تحریر لانے کے بعد میں ان پر کچھ تجزیہ پیش کرنا چاہتا ہوں، اور اس تجزیہ وتبصرہ کی مخاطب درحقیقت فکرِ اقبال نہیں، کیوں صاحبِ فکر نے تو اخیر دور میں اس نظریہ سے رجوع کرلیا تھا، یہ تجزیہ ان لوگوں کی خدمت میں ہے جو علامہ کے بیان کردہ ان نکات کو لیکر ہمارے اس دور میں بھی اجتہاد کا نظریہ اپنائے ہوئے ہیں۔

الغرض پہلا نکتہ تھا ابتدائی دور سے لیکر عباسیہ کے اخیر دور تک فکرِ اسلامی کا کوئی قانون نہیں تھا، آزادئ اجتہاد پر عمل ہوتا تھا، اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ عباسیہ کا دور ۱۳۲ھ (تاریخ اسلام: ۸۹۲/۱، اکبر شاہ خان نجیب آبادی، دارالاندلس ۱۴۲۶ھ) سے لیکر ۶۵۶ھ (تاریخ اسلام: ۳۴۳/۲، اکبر شاہ خان نجیب آبادی، دارالاندلس ۱۴۲۶ھ) تک رہا، علامہ کے کہنے کے مطابق ۶۵۶ھ تک آزادئ اجتہاد پر عمل ہوتا رہا، اور اس وقت تک ابھی قانون بھی نہیں بنا تھا، صحیح بات یہ ہے کہ آزادیٔ اجتہاد پر عمل ۶۵۶ھ تک نہیں بلکہ چوتھی صدی ہجری تک ہی ہوا ہے، اس کے بعد وہ حق ختم کردیا گیا، اس پر روک لگادی گئی، چنانچہ سرفراز صفدر خان صاحبؒ، علامہ فرحونؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

> کہ اب تقلید انہی مذاہب میں منحصر ہے اور محققین کے نزدیک اگرچہ پیش آمدہ مسائل میں فی الجملہ اجتہاد تا قیامت باقی رہے گا، لیکن اجتہادِ مطلق حضراتِ مجتہدین پر ختم ہوچکا ہے، اور یہ رُتبہ کسی اور کو نہ مل سکا اور نہ مل سکتا ہے۔ (الکلام المفید فی اثبات التقلید، ص: ۱۱۶، مولانا سرفراز خان صفدر صاحبؒ، مکتبہ دارالعلوم دیوبند ۲۰۱۴ء)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ آزادیٔ اجتہاد پر عمل ۶۵۶ھ تک نہیں بلکہ چوتھی صدی پر ختم ہوگیا تھا، کیوں کہ چوتھی صدی سے پہلے تک کا دور تدوین کا دور تھا، اور اس دور میں جو آزادیٔ اجتہاد پر عمل پیرا تھے، وہ واقعتاً قابل اور لائق لوگ تھے، ہر کس وناکس نہیں کرتا تھا، بعد کے اَدوار میں اور آج کے زمانے میں چوں کہ اس کے قابل اور لائق لوگ نہیں رہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تو اس کا دروازہ بند کردیا گیا، لہٰذا اِس دور میں اس نکتہ کو بیان کرکے اجتہاد کی بات کرنا درست اور صحیح نہیں ہے۔

علامہ نے دوسرا نکتہ بیان کیا تھا کہ پہلی صدی کے نصف سے لیکر چوتھی صدی تک اُنیس مکاتب فکر بنے، (جو کہ آزادئ اجتہاد کا نتیجہ تھا) اور متعدد لوگ اجتہاد کرتے تھے، جن میں امام اوزاعیؒ ہیں، امام ابن خزیمہؒ ہیں، امام ابن جریر طبری ہیں، امام ابوثور بھی ہیں۔

اس دور میں متعدد مکاتب فکر کا وجود میں آنا یہ بھی اس وجہ سے تھا کہ جس میں بھی اجتہاد کی قابلیت تھی وہ اجتہاد کر کے اپنا ایک مذہب بناتا، کچھ لوگ اس کے پیروکار ہو جاتے، اس طرح متعدد مکاتب فکر بن گئے، لیکن یہ مکاتبِ فکر بعد کو باقی نہیں رہے، کچھ تو ختم ہو گئے، کچھ ان چار میں مل گئے، سرفراز خان صفدر صاحب ''تذکرہ'' کے حوالہ سے یہ بات نقل کرتے ہیں کہ

> ثم فنى العارفون به وبقي منه ما يوجد في كتب الخلاف. (الکلام المفید فی اثبات التقلید، ص: ۱۱۰، مولانا سرفراز خان صفدر، مکتبہ دار العلوم دیوبند ۲۰۱۴ء)
>
> پھر ان کے جاننے والے مٹ گئے اور کتب خلاف میں صرف ان کا نام ہی باقی رہ گیا۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ متعدد مکاتب تو بنے، لیکن بالآخر جب وہ انہی چار میں ضم ہو گئے اور اصل الاصول یہی چار مسالک ٹھہرے اور مجتہدین کے جملہ اجتہادات کسی نہ کسی طریقے سے ائمہ اربعہ کے اجتہادات ہی کے موافق نکلے تو اب اس کو بنیاد بنا کر اس دور میں اجتہاد و آزادیٔ فکر کا نظریہ رکھنا درست نہیں ہے، شاید یہی بات ہوگی جو علامہ اقبالؒ کو سمجھ میں آ گئی تھی، جس بنیاد پر علامہ بھی اپنے نظریہ سے رجوع کر لیا۔

علامہ اقبال نے تیسرا نکتہ اس طرح بیان کیا تھا کہ اسلامی مآخذ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں مزید اجتہاد کے امکانات اور ارتقاء کا معاملہ واضح ہوتا ہے، علامہ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ قرآنی تعلیمات سے اجتہاد کے مزید امکانات واضح ہوتے ہیں، مگر یہ اہلِ اجتہاد کے حق میں ہے اور چوتھی صدی ہجری تک اہلِ اجتہاد پائے گئے، کیوں کہ ضرورت بھی تب ہی تھی، قدرتی قاعدہ بھی ہے، عموماً چیز وہیں مہیا ہوتی ہے جہاں ضرورت ہوتی ہے، تو چوتھی صدی تک ان کی ضرورت تھی، وہ پائے گئے اور دین مدوّن ہو گیا، اب اس تدوین کی ضرورت نہیں رہی تو اہلِ اجتہاد بھی نہیں پائے جائیں گے، ہاں جس قدر اجتہاد کی ضرورت (اصولِ مجتہدین کے تحت جزئیاتِ جدیدہ کا استخراج کرنا) ہو سکتی ہے، وہ ضرور رہے گا اور اس کے اہل بھی پائے جائیں گے، لہٰذا آج کے دور میں قرآنی آیات کی عمومیت کو لیکر مطلق اجتہاد کا نظریہ رکھنا اور تدوینِ فقہِ جدید کی ضرورت محسوس کرنا درست نہیں ہے۔ (اجتہاد و تقلید کا آخری فیصلہ، ص: ۵۹، حکیم الامت تھانویؒ، ادارہ افادیات اشرفیہ لکھنؤ، سن طباعت ۱۴۳۵ھ)

علامہ کے نظریہ اجتہاد پر عمل کی گنجائش بھی ہے؟

علامہ نے تو آزادیٔ اجتہاد کے نظریہ سے اپنے اخیر دور میں رجوع کر لیا تھا، اور تقلید کے قائل ہو گئے تھے، جس کو کہ ہم آگے مدلل بیان کرنے والے ہیں، لیکن کچھ لوگ ہیں جو اِس دور میں علامہ کے حوالہ سے اجتہاد کا نظریہ رکھتے

ہیں، اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں ہیں تو ان کے اس رویہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس دور میں اس پر عمل ہوسکتا ہے؟ اس بات کو حل کرنے کے لئے میں حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانویؒ کی عبارت نقل کرنا مناسب سمجھتا ہو، حضرت کے الفاظ ہیں:

> قدرتی قاعدہ ہے کہ ہر شئ عموما اپنی ضرورت کے وقت ہی ہوا کرتی ہے، جس فصل میں عموما بارش کی حاجت ہوتی ہے، اسی فصل میں بارش ہونے کا قاعدہ ہے، اسی طرح ہوائیں حاجت کے وقت چلا کرتی ہیں جہاں سردی زیادہ پڑتی ہے، وہاں جانوروں کے اون بہت بڑے ہوتے ہیں، اس کے بے شمار نظائر ہیں، اسی طرح جب تک تدوینِ حدیث کی ضرورت تھی بڑے بڑے قوی حافظہ کے لوگ پیدا ہوئے تھے اب ویسے نہیں ہوتے، اور تو اور اہلِ حدیث میں سے بھی کسی کو بخاری اور مسلم کی طرح مع سند (احادیث) حفظ نہیں، اسی طرح جب تک تدوینِ دین کی ضرورت تھی، قوتِ اجتہادیہ لوگوں میں بخوبی موجود تھی، اب چوں کہ دین مدوّن ہو چکا ہے اور اصول وقواعد ممہّد ہو چکے ہیں، اب اجتہاد کی اتنی ضرورت نہیں رہی، ہاں جس قدر اب بھی اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے، اتنی قوتِ اجتہادیہ بھی باقی ہے، یعنی اصولِ مجتہدین کے تحت جزئیاتِ جدیدہ کا استخراج کرلینا۔ (اجتہاد وتقلید کا آخری فیصلہ، ص: ۵۹، حکیم الامت تھانویؒ، متوفی ۱۳۶۲ھ، ادارہ افادیات اشرفیہ لکھنؤ ۱۴۳۵ھ)

حضرت نے اس اقتباس میں واضح کردیا کہ تدوینِ دین مکمل ہوچکی ہے، اب اجتہاد کی ضرورت نہیں رہی، لہٰذا اس پر عمل بھی نہیں ہوگا، یہی بات ابن خلدونؒ اپنے مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں:

> ووقف التقليد في الأمصار عند هؤلاء الأربعة ودرّس المقلدون لمن سواهم وسدّ الناس باب الخلاف وطرقه ... ولما عاق عن الوصول إلى رتبة الاجتهاد ولما خشي من إسناد ذلك إلى غير أهله ومن لا يوثق برأيه ولا بدينه فصرحوا بالعجز والإعواز وردّوا الناس إلى التقليد ... ومدعى الاجتهاد لهذا العهد مردود على عقبيه مهجور تقليده وقد صار أهل الإسلام اليوم على تقليد هؤلاء الأئمة الأربعة. (تاریخ ابن خلدون: ۱/۵۶۶، الفصل السابع

فی علم، عبدالرحمٰن بن محمد، ابن خلدون، دارالفکر، بیروت ۱۴۰۸ھ)

اس اقتباس میں علامہ ابن خلدونؒ نے بھی واضح کر دیا کہ آج تقلید ان چار مذاہب میں منحصر ہو چکی ہے، قابلیتِ اجتہاد کی کسی میں امید نہیں رہی، لہٰذا اس دور میں اگر کوئی اجتہاد کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ مردود ہے، اس دور میں نہ اجتہاد کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے نہ اس پر عمل ہو سکتا ہے، لہٰذا اس دور میں اس طرح کا نظریہ رکھنا بے فائدہ ہے۔

علامہ کا اپنے نظریہ سے متعلق سید سلیمان ندویؒ کو خط

علامہ خود ان کے اعتراف کے مطابق کسی عالمِ دین سے اسلامی تعلیم یافتہ نہیں تھے (اقبال نامہ مجموعہ مکاتیبِ اقبال، ص: ۴۹، شیخ عطاء اللہ، شعبہ معاشیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) جس کی بنیاد پر وہ سوچنے میں تو آزاد تھے، لیکن کسی بھی چیز پر عمل پیرا ہونے میں اور اس کو نافذ کرنے میں، علماء کے محتاج تھے، چنانچہ جب علامہ نے اپنا یہ نظریہ بنایا کہ قرآن کی تعلیمات کی عمومیت سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ذہنوں پر طاری جمود کو ختم کر کے ذہن کو آزاد کیا جائے، فقہ کی تدوینِ جدید کی جائے، تو علماء کے محتاج ہو گئے، علماء کی تائید طلب کرنے لگے اور ان کو خطوط لکھنا شروع کر دیا، چنانچہ اسی سے متعلق ایک خط علامہ سید سلیمان ندویؒ کو لکھا تھا:

> میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص زمانۂ حال کے اصول وقانون پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیّت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدّد ہوگا، اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا، قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور وفکر کر رہے ہیں، غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، کیوں کہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام اس وقت گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (فکر اقبال، مقالاتِ حیدر آباد سمینار، ص: ۱۹۰، سعید احمد اکبر آبادی، کل ہند اقبال صدی تقاریب، کمیٹی، حیدر آباد ۱۹۷۷ء)

یہ وہ خط تھا جس میں علامہ نے اپنی رائے ونظریہ کو ظاہر کرتے ہوئے حضرت سے مدد طلب کی تھی، اب ہم اس بات کے منتظر ہیں کہ سیّد صاحب کا جواب آیا بھی یا نہیں؟ کیوں کہ بظاہر یہ نظریہ ایسا ہے جو کبارِ علماءِ امت کے نظریہ سے مختلف ہے، پھر آیا تو تائید میں آیا یا تنقید میں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا موقف

سید صاحب اور علامہ کے باہمی مراسلت کے ریکارڈ میں ایسے کسی خط کا سراغ نہیں ملتا جو سید صاحب نے اس کے جواب میں لکھا ہو، لیکن اتنا ضرور ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بعد کی اپنی تحریروں میں اپنے زمانہ کے قائلینِ اجتہاد پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے:

> یہ دلچسپ بات ہے کہ تمام جدیدیت پسند، کرامت علی سے مشرقی اور اقبال تک سب اسلام کی اصلاح کے درپے ہیں، ایک بھی ایسا نہیں جو مغرب کی اصلاح چاہتا ہو... سب اسلام کو بدلنا چاہتے ہیں اور اس کو بدلنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے، ان میں سے کچھ عربی نہیں جانتے... مسلمانوں کا اصل انحطاط اور ذلت کی آخری حد یہی ہے کہ انہیں اپنے عروج کے لئے اپنے آپ کو سنبھالا دینے کے لئے سہارا کہاں سے ملے گا؟ اللہ سے، اس کے رسول سے، اپنے نظریۂ حیات سے، نہیں بلکہ یورپ کے اصولوں سے، تجربیت سے، سائنس سے، عقلیت سے، معتزلہ سے.. یہ پستی کی انتہا ہے،... یہ اقبال کی سب سے بڑی غلطی ہے اور ناقابلِ معافی غلطی کہ مغرب کی سائنس اور فلسفے کو منہاجِ حقیقی بنا کر دین کی تعلیمات کو اس پیمانے پر پرکھا جائے نہ کہ دین کو اصل حقیقی اور درست منہاج سمجھ کر مغرب کے فکر وسائنس کو اس پیمانے پر پرکھا جائے... خطباتِ اقبال نے جہاں جہاں مغربی فکر وفلسفہ کو قرآن سے ثابت کیا ہے، یہ تمام استدلال سرے سے غلط ہے... تقلید کے جمود سے نکلنے کے لئے اقبال مرحوم نے حرکت کا ایک ایسا تصور اختیار کرلیا جو صحفِ سماوی کی تاریخ میں اور مذہبی تہذیبوں کی تاریخ میں خالصتاً اجنبی تصور ہے۔ (aallamahiqbal,blogsky.c om/139/... بعنوان
> خطباتِ اقبال پرسید سلیمان ندویؒ کا تبصرہ)

اس اقتباس میں سید سلیمان ندویؒ نے علامہ کے نظریہ کا جواب دیا ہے، تائید میں نہیں بلکہ تنقید میں، انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو جوابی خط تنقید میں ہی ہونا تھا، کیوں کہ آج اسلامی قانون پر بنیادی واصولی اعتبار سے بحث وتمحیص کی چنداں ضرورت نہیں رہی، اسلامی قانون کا کوئی شعبہ اب بچا ہی نہیں کہ جس میں ائمہ نے رائے قائم نہ کی ہو اور قاعدہ وضع نہ کیا ہو، علامہ ابن منیرؒ لکھتے ہیں:

> أما كونهم ملتزمين، أن لا يحدثوا مذهبا، فلإن إحداث مذهب زائد بحيث يكون لفروعه أصول وقواعد مبانية لسائر قواعد المتقدمين فمتعذر الوجود، لاستيعاب المتقدمين سائرَ الأساليب. (رسم المفتی، ص: ۱۳۴، ابن عابدین، متوفی ۱۲۵۲ھ، مکتبہ زکریا دیوبند ۱۴۲۱ھ)
>
> صاحبین کا اجتہاد کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اپنے امام کی تقلید کو لازم کرلینا اس وجہ سے تھا کہ ان کا اجتہاد پر عمل کرتے ہوئے کوئی ایسا نیا مذہب شروع کرنا جس کی جملہ فروعات کے لئے ایسے اصول وقواعد ہوں جو متقدمین کے اصولوں سے علیحدہ ہوں تقریباً ناممکن تھا، کیوں کہ متقدمین نے تمام ممکن صورتوں کا احاطہ کرلیا ہے۔

بقول علامہ ابن منیر جب ہر شعبہ کا ائمہ نے احاطہ کرلیا ہے پھر اس کے باوجود کوئی اجتہاد کی ضرورت محسوس کرے، عقل کیسے باور کرسکتی ہے، شاید یہی حقیقت ہوگی جو علامہ کو اخیر دور میں سمجھ آ گئی تو علامہ نے اس نظریہ سے رجوع کرلیا۔

علّامہ اقبال کا نظریہ ''پارلیمانی اجتہاد''

اس موضوع کو شروع کرنے سے پہلے پارلیمنٹ کی مختصر الفاظ میں وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں، تا کہ آگے بات سمجھنے میں آسانی ہو، پارلیمنٹ (Parliament) در اصل انگریزی لفظ ہے، جو کہ فرانسی لفظ (Parlement) سے بنا ہے جس کے معنی بولنے، بات کرنے، گفتگو کرنے کے آتے ہیں، پس اس اعتبار سے پارلیمنٹ سے مراد باہمی مباحثہ یا باہمی مکالمہ کرنا ہوا، ہمارے زمانہ میں اس لفظ کا استعمال جس معنی میں ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ کسی خطّۂ ارضی میں قائم موجود ایک ایسی مجلس یا ہیئت جو عوام الناس کے منتخب کردہ نمائندوں پر مشتمل ہو اور اس میں ریاست سے متعلق مسائل پر بحث و گفتگو ہوتی ہو، اس طرح کی مجلس پر فی زمانہ پارلیمنٹ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، بعض ممالک میں اس کو نیشنل اسمبلی (National assembly) یا سینٹ (Senate) کا نام بھی دیا جاتا ہے، معروف دائرۃ المعارف (Encyclo padia) ویکیپیڈیا (wiki pedia) میں پارلیمنٹ کی اس طرح تعریف بیان کی گئی ہے، پارلیمنٹ سے مراد مُقنّنہ یعنی مجلسِ قانون ساز ہے، جب کہ جدید معانی میں پارلیمنٹ سے مراد افراد کی ایک ایسی مجلس ہے جو کسی ریاست کے مسائل پر بحث کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہوں۔ (عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد ایک تجزیاتی مطالعہ: ۲/۳۶۲، حافظ محمد زبیر، شیخ زائد اسلامک سینٹر، لاہور ۲۰۱۰ء)

اب تک کی بحث سے معلوم ہوا کہ علامہ کا قدیم نظریہ آزادئ اجتہاد کا تھا تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن دنوں علامہ کس کے لئے حقِ اجتہاد ثابت کرنا چاہتے تھے، آیا ہر کس و ناکس کے لئے یا پھر قابل علماء کے لئے فرداً فرداً، یا پھر منتخب علماء کے لئے اجتماعاً، جب ہم علامہ کے خطبات کا مطالعہ کریں گے تو علامہ کے خطبہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ حقِ اجتہاد نہ ہر کس و ناکس کے لئے ثابت کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی قابل علماء کے لئے فرداً فرداً، بلکہ علامہ پارلیمان میں منتخب علماء کے ذریعہ اجتماعی اجتہاد کے قائل تھے، چنانچہ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

فقہِ اسلامی کا تیسرا مآخذ اجماع ہے اور میرے نزدیک اسلام کے قانونی تصورات

> میں سب سے زیادہ اہم ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس نہایت ہی اہم تصور پر اگر چہ صدرِ اسلام میں نظری اعتبار سے تو خوب خوب بحثیں ہوتی رہیں، لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک خیال سے آگے نہیں بڑھی، ... کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ممالکِ اسلامیہ میں یہ تصور ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار کر لیتا ہو، شاید اس لئے کہ خلیفۂ چہارم کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان ملوکیت نے سر اٹھایا تو یہ اس کے مفاد کے خلاف تھا کہ اجماع کو ایک تشریعی ادارے کی شکل دی جائے، اموی اور عباسی خلفاء کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین ہی کے ہاتھ میں رہے، اس کے بجائے کہ اس کے لئے ایک مستقل مجلس قائم ہو، جو بہت ممکن ہے، انجام کار اُن سے بھی زیادہ طاقت حاصل کر لیتی، بہر حال یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو نئی قوتیں ابھر رہی ہیں کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے، بلادِ اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشو ونما اور قانون ساز مجالس کا بہ تدریج قیام ایک بڑا ترقی زا قدم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذاہبِ اربعہ کے نمائندے جو سرِ دست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں، اپنا یہ حق مجالسِ تشریعی کو منتقل کر دیں گے، یوں بھی مسلمان چوں کہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لئے ممکن بھی ہے تو اس وقت اجماع کی یہی شکل، مزید برآں غیر علماء بھی جو ان امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، اس میں حصہ لے سکیں گے، میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لیکر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظاماتِ فقہ میں خوابیدہ ہے، از سرنو بیدار کر سکتے ہیں، یوں ہی اس کے اندر ایک ارتقائی مطمحِ نظر پیدا ہوگی۔ (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص: ۲۶۸، سید نذیر نیازی، اسلامک بک سینٹر دہلی، ۱۹۸۶ء)

ہر چند کہ علامہ کے اس بیان کے دو تین اجزاء قابل بحث ہیں اور ان پر تنقید و تبصرہ کی بھی بہت کچھ گنجائش ہے،

لیکن ہماری تحقیق کے مطابق چوں کہ علامہ نے اس نظریہ سے رجوع کرلیا تھا، اس لئے سرِ دست یہاں اس تعلق سے ہم کچھ ذکر نہ کریں گے اور اس کے بغیر ہی بات آگے بڑھائیں گے۔

نظریۂ پارلیمانی اجتہاد پر ہم عصر علماء کی آراء

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ نے جب اپنا نظریہ پارلیمانی اجتہاد پیش کیا تھا تو ہم عصر علماء کا کیا رویہ تھا، کیا کوئی عالم دین علامہ کا ساتھ بھی دیا تھا، یا سب علامہ کی تردید میں تھے، تو اس کا جواب کچھ اس طرح ہے کہ علامہ نے اپنا نظریہ بیان کیا کہ پارلیمانی اجتہاد ہونا چاہئے، تو برصغیر ہندوپاک کے جلیل القدر علماء نے علامہ کے نظریہ کی تردید کی اور خطباتِ اقبال کو اسلام کے بنیادی اور اجماعی نظریات سے متصادم قرار دیا اور خطبات کی اشاعت کو ناپسند فرمایا، سلیم احمد صاحب لکھتے ہیں:

> اقبال سے جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے، ان میں مولانا اکبر الہ آبادی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی اور مولانا مودودی جیسی جیّد شخصیتیں شامل ہیں، ...خود اقبالؒ کا حال یہ تھا کہ بقول نذیر نیازی جیسے اقبالی کے، جب انہوں نے اقبال سے خطبات کے بعض مقامات کی وضاحت چاہا تو علامہ یہ کہہ کر بری الذمہ ہوگئے کہ بعض اوقات میری کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم ہوتا کہ میں کیا کہہ گیا ہوں۔ (عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد کا ایک تجزیاتی مطالعہ: ۲/۳۶۷، حافظ محمد زبیر، شیخ زائد اسلامک سینٹر لاہور ۲۰۱۵ء)

اس اقتباس سے اندازہ ہوگیا کہ اس وقت علامہ کے اس نظریہ سے وقت کے علماء کس درجہ غیر متفق تھے، خود علامہ اقبال کے فرزند جسٹس جاوید اقبال اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> سید سلیمان ندویؒ کو خطبات کی اشاعت پسند نہ تھی، علامہ سلیمان ندویؒ نے کہا کہ اس کتاب کو شائع نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ (حوالہ سابق)

علامہ ابوالحسن علی ندویؒ کی بھی اس وقت کے نظریۂ اقبال سے متعلق کچھ اسی طرح کی رائے تھی، چنانچہ فرماتے ہیں:

> ان کے مدراس کے خطبات جو انگریزی میں Reconstruction of

> Religions Thoght in Islam کے نام سے شائع ہوئے، اور ان کا اردو اور عربی میں ترجمہ بھی ہوا ہے، بہت سے ایسے خیالات وافکار ملتے ہیں جن کی تاویل توجیہ اور اہل سنت کے اجماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ (حوالہ سابق)

اپنی کتاب نقوش اقبال میں مزید لکھتے ہیں:

> میں اقبال کو کوئی معصوم ومقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ ہی ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حدِ افراط کو پہنچا ہوا ہوں، جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سنائی عطار اور عارف رومی آدابِ شریعت کے پاس ولحاظ ظاہر وباطن کی ایک رنگی اور دعوت وعمل کی ہم آہنگی میں ان سے بہت آگے ہیں، اقبال کے ہاں اسلامی عقیدۂ فلسفہ کی ایسی تعبیریں ملتی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے، میں بعض پر جوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم وحقائق تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے مقتدر معاصرین سے برابر استفادہ ہی کرتے رہے، ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم وفن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے، اور جنھیں دور کرنے کا موقع انہیں نہیں ملا۔ (نقوش اقبال، ص: ۳۴، ابوالحسن علی ندوی، متوفی ۱۴۲۰ھ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۱۴۳۱ھ)

میرا مقصود علماء کی تنقیدات کو نقل کرنے سے علامہ کے نظریہ کے غلط ہونے کو ثابت کرنا نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو علامہ کے رجوع کر لینے سے ہی ثابت ہو چکا ہے، مجھے تو ان لوگوں کو بات سمجھانا ہے جو علامہ کے رجوع کر لینے کے باوجود ان کے حوالہ سے آج بھی اس طرح کا نظریہ اپنائے ہوئے ہیں۔

نظریۂ پارلیمانی اجتہاد پر سید سلیمان ندویؒ کی رائے

جہاں علامہ اقبال کے نظریہ ''پارلیمانی اجتہاد'' پر دیگر علماء نے اپنی اپنی ناقدانہ رائے پیش کی ہے وہیں علامہ کے استاذ سید سلیمان ندویؒ نے بھی اپنی تنقیدی رائے بیان کی ہے، کیوں کہ علامہ اقبال کا وہ خطبہ جو پارلیمانی اجتہاد سے متعلق تھا، بہت سی ناقابل فہم اور محال باتوں پر مشتمل تھا، جیسے علامہ کا اپنے خطبہ میں غیر عالم کو بھی لائقِ اجتہاد ٹھہرانا،

آزاد خیالی اور اجتہادی صلاحیتوں کے فقدان کے ایسے دور میں علامہ کا پارلیمانی علماء کے ذریعہ اجتہاد کی بات کرنا، وغیرہ۔

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> قدیم علماء نے اجتہاد کے لئے جو شرائط طے کئے ہیں وہ شرائط اقبال کو عصر حاضر کے کسی فرد میں نظر نہ آئیں تو انہوں نے اجتماعی اجتہاد اسمبلی کے ذریعہ کرنے کا اجتہاد فرمایا جب شرائطِ اجتہاد فرد میں نہیں پائی تو اسمبلی میں کیسے اکٹھی ہوسکتی ہیں، سو صفر اکٹھے ہوکر ایک کیسے بن سکتے ہیں، اسمبلیوں کے انتخابات کا تماشہ ہندوستان میں بہت دیکھا جاچکا ہے، یہ اسمبلیاں کیسے اجتہاد کرسکتی ہیں؟ اسمبلی کے انتخابات کی بنیاد مساوات کے نظریے پر ہے، تمام انسان برابر ہیں، ایک زمانہ تھا جب ہند میں صرف ٹیکس دینے والے ووٹ دے سکتے تھے وہ زمانہ بھی ختم ہوگیا، ہم پاکستان کے اسمبلی کو اجتہاد کے قابل نہیں سمجھتے، اس کے اراکین کا دینی علوم سے کیا تعلق، ایک آدھ استثناء چھوڑ دیجئے۔ (عصر حاضر اجتماعی اجتہاد ایک تجزیاتی مطالعہ: ۳۶۹/۲، حافظ محمد زبیر، شیخ زائد اسلامک سینٹر لاہور ۲۰۱۰ء)

یہاں سید سلیمان ندویؒ نے جس بدیہی اصول کو بیان کرکے علامہ کے نقطۂ نظر کی تردید فرمائی ہے وہ بالکل معقول ہے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ جیسا ذہین انسان اس مسئلہ میں کیسے ٹھوکر کھا گیا؟ اس بات کا جواب بھی علامہ کے استاذ سید ندویؒ ہی حل کرتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

> مغرب سے مغلوبیت نے اقبال کو یہ باطل خیال پیش کرنے پر مجبور کیا کہ اسلامی قانون کی روح جمہوری ہے، جمہور اور اجماع کی اصطلاحات سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھے کہ نئے مسائل پیش آنے پر جمہوری طریقے سے لوگوں کی رائے لیکر قانون وضع کرلیا جائے گا اور غالباً اسمبلی ان کی نظر میں اجماع اور جمہور کا متبادل تھا، فقہ اسلامی میں جمہور سے کیا عوام مراد ہیں، اقبال مرحوم اس اصول سے تو آگاہ ہوں گے، لیکن اسکی تفہیم انہوں نے مغربی منہاج میں کی تو یہ گمراہی خودبخود پیدا ہوگئی اور اقبال مرحوم کے ہاں ایسی بے شمار غلطیاں ملیں گی۔ (ایضا: ۳۷۱/۲)

اقبال مرحوم کے اس مغالطہ کی سخت تردید کرتے ہوئے سید سلیمان ندویؒ آگے ارقام فرماتے ہیں کہ:

> اجماعِ جمہور کو جمہوریت اور پارلیمنٹ کی اصطلاحات کے مساوی قرار دینا علومِ اسلامیہ کی تاریخ سے کامل ناواقفیت کا اظہار ہے، یہ بھی خلطِ مبحث ہے، اسلام میں اجماع جہلاء کا نہیں ہے، اجماع علماء کا معتبر ہے، عوام کا نہیں، یہ علماء کون لوگ ہوں گے، اس کے بھی اصول طے ہیں، اجماع کو لادینی سیاسی نظام کے جمہوری ادارے پارلیمنٹ کا متبادل سمجھنا اقبال مرحوم کی بہت بڑی غلطی تھی۔ (حوالۂ سابق)

اس نظریہ پر علماء کی جتنی بھی تنقیدیں ہو رہی ہے ان کا ہدف آج علامہ اقبال کی شخصیت نہیں رہی، کیوں کہ علامہ نے تو اس نظریہ سے رجوع کرلیا، جو حضرات آج بھی اس نظریہ پر باقی ہیں قائم ہیں، وہ ان تنقیدات کے اصل نشانہ ہیں۔

پارلیمانی اجتہاد سے متعلق شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب کی رائے

موجودہ دور کے مشہور ومعروف عالم دین شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ کی نگاہ جب لوگوں کی اختیار کردہ نظریۂ پارلیمانی اجتہاد پر پڑی تو حضرت شیخ الاسلام نے اس مسئلہ کی حقیقت کو واضح کردیا کہ اجتہاد ہر کس وناکس کا کام نہیں ہے، اس کے لئے تو علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، علم اصول کا ہونا ضروری ہے، یہ کام تو اس دور میں فرد سے بھی ممکن نہیں ہے، بلکہ محال ہے، اس کو پارلیمان کے حوالے کرنا گویا ایک دینی امر کو نااہل کے ہاتھ سونپنا ہے، چنانچہ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

> وهناك فكر ة خاطئة أخرى اقترحت في عدة كتابات أن يفوض الاجتهاد إلى البارليمان ... فيقول أصحاب هذه الفكرة أن ما يتفق عليه البارليمان هو أمثل حلٍ لأية قضية جديدة لأنه يتبع من رجال انتخبهم ا الشعب لهذا الغرض وإن هذه الفكرة مبنية على الجهل أو التجاهل عن معنى الاجتهاد ومقتضياته الحقيقية أن الاجتهاد في ا لأمر الشرعية ليس تحكيما للعقل المجرد، وإنما هو بذل الجهد في معرفة الحكم

الشرعي على أساس القرآن والسنة وذلك يتطلب مستوى رفيعا من العلم بالتفسير والحديث والفقه وأصوله وليس ذلك شأن كل من هبّ ودبّ بل لا يمكن يعاطيه مما تخصص في علوم أخرى ولم يدرس علوم الشريعة من متابعها الأصلية وإن أعضاء البارليمان اليوم لا ينتخبون على أساس علمهم بالدين وعلومه فتفويض الاجتهاد إليهم تحميلهم ما لا يطيقون وتفويض لهذا الأمر الخطير إلى غير أهله، (الاجتہاد الجماعی، ص: ١٠، مفتی تقی عثمانی)

ہمارے ہاں ایک اور گمراہ کن فکر جس کو بعض مفکرین نے اجاگر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اجتہاد کا حق پارلیمنٹ کو تفویض کر دیا جائے... اس فکر کے حاملین کا کہنا یہ ہے کہ جس پر پارلیمنٹ کا اتفاق ہوجائے وہ کسی بھی جدید مسئلے کو حل کرنے کا بہترین طریقہ ہے، کیوں کہ پارلیمنٹ کے اراکین کو عامۃ الناس اسی مقصد کے لئے منتخب کرتے ہیں، یہ فکر معنئ اجتہاد اور اس کے حقیقی مقتضیات سے جہالت یا تجاہل پر مبنی ہے، شریعت اسلامیہ میں اجتہاد محض عقلی رائے یا فیصلے کا نام نہیں ہے، بلکہ اجتہاد سے مراد قرآن وسنت کی بنیاد پر شرعی حکم معلوم کرنے کی جدوجہد ہے اور اس مقام ومرتبے کے لئے تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ وغیرہ جیسے علوم میں پختگی ضروری ہے اور ان علوم میں رسوخ ہر ایرے غیرے کو حاصل نہیں ہوتا، بلکہ وہ شخص جو دوسرے علوم میں تو ماہر ہو لیکن اس نے علومِ شرعیہ کو ان کے بنیادی مصادر سے نہ سیکھا ہو، اس کے لئے بھی ان علوم کی خدمت کرنا ممکن نہیں ہے، آج کل پارلیمنٹ کے اراکین اپنے دینی علم یا علومِ شرعیہ میں رسوخ کی بنیاد پر منتخب نہیں کئے جاتے، پس پارلیمنٹ کے ان اراکین کو اجتہاد کا فریضہ سونپنا، ان کو تکلیف مالا یطاق کا حامل بنانا ہے اور ایک اہم دینی فریضے کو نااہل لوگوں کے سپرد کرنا ہے۔

اس نظریہ کی ناکامی کے اسباب

علامہ کا نظریہ ''پارلیمانی اجتہاد'' جو قابل عمل نہیں رہا، اور عند العلماء مقبول نہیں ہوا، اس کی کچھ وجوہات جو میری سمجھ میں آ رہی ہیں یہ ہوسکتی ہیں:

(۱) علامہ نے نہ صرف اجتماعی اجتہاد کا نظریہ پیش کیا، بلکہ اس کو اجتہادِ مطلق کے ساتھ جوڑ دیا یعنی اجتماعی اجتہاد ہو، مطلق اجتہاد کے ذریعہ، حالانکہ ضرورت کے پورا ہو جانے کی وجہ سے چوتھی صدی کے بعد سے ہی باتفاق علماء مطلق اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، اس کا دروازہ انفراداً بھی بند ہو گیا، اجتماعاً بھی، یعنی اس دور میں نہ انفرادی طور پر مطلق اجتہاد پر عمل ہوسکتا ہے نہ اجتماعی طور پر، گویا جو کام عقل و نقل کی رو سے اس دور میں ناممکن تھا، علامہ نے اس کام کا نظریہ بنا لیا تھا، اس بنیاد پر یہ نظریہ قابل عمل نہیں رہا۔

(۲) علامہ اقبال نے منتخب علماء کے ذریعہ پارلیمان میں اجتہاد کرانے کی بات کی، حالانکہ پارلیمان ایسی جگہ ہے نہیں کہ وہاں اسلامی احکام کو اجتہاد سے حل کرسکیں۔

(۳) علامہ نے منتخب علماء کے ذریعہ پارلیمان میں اجتہاد کرانے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہی کہ غیر عالم ان کے ساتھ شریک ہوسکے گا، اور اس میں حصہ لے سکے گا، جب کہ غیر عالم اجتہاد کا اہل ہے ہی نہیں، جب اہل نہیں ہے تو اس کو شریک کرنا کیسے درست ہوگا۔

اجتماعی اجتہاد قرونِ اولیٰ میں اور اب اس کی صورت

حقیقت پر اگر نگاہ ڈالیں تو یہ بات ملتی ہے کہ اجتماعی اجتہاد کی اجازت شریعت نے دے رکھی ہے، ضرورت کے وقت اس پر عمل کرنے کی خود ترغیب بھی دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی مثالیں عہد صحابہ میں بھی ملتی ہیں، عہد تابعین میں بھی اور ہمارے اس دور میں بھی اس پر عمل ہوگا، لیکن کچھ فرق کے ساتھ جس کو ہم آگے بیان کریں گے، اب دیکھتے ہیں کہ شریعت اس کی اجازت کیسے دیتی ہے؟

> عن عليؓ قال: قلت: يا رسول الله! إن نزل بنا أمر ليس فيه بيان أمر ولا نهى فما تأمرنا؟ قال: شاوروا الفقهاء والعابدين، ولا تمضوا فيه رأى خاصة. (المعجم الاوسط: ۱۷۲/۲، باب من اسمہ محمد، متوفی: ۳۶۰ھ، سلیمان بن احمد ابوالقاسم الطبرانی، ناشر: دارالحرمین القاہرہ ۱۴۱۵ھ)
>
> علیؓ روایت کرتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہؐ! اگر ہمیں ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کے متعلق کوئی امر نہ ہو تو اس صورت میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیں گے،

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ فقہاء اور عابدین آپس کے مشورہ سے اس مسئلہ کو حل کریں۔

اس حدیث میں رسول اللہؐ نے امت کو طریقہ بتلایا کہ غیر مذکورہ مسائل کو وقت کے فقہاء اور عابدین اجتماعیت سے حل کریں، جب صحابہ کرامؓ نے ضرورت محسوس کی تو اپنے اپنے دور میں اس پر عمل بھی کیا، چنانچہ میمون بن مھران حضرت ابوبکر صدیقؓ سے متعلق بیان کرتے ہیں:

> كان أبو بكرؓ إذا ورد عليه خصم نظر في كتاب الله فإن وجد فيه ما يقضي به، قضى به، فإن لم يجد في الكتاب نظر هل كانت من النبيؐ فيه سنة، فإن علمها قضى به، وإن لم يعلم خرج فسأل المسلمين، فقال أتانى كذا وكذا فنظرت في كتاب الله وفي سنة رسول اللهؐ فلم أجد في ذلك شيئا فهل تعلمون أن النبيؐ قضى في ذلك بقضاء؟ فربما قام إليه الرهط فقالوا: نعم قضى فيه بكذا وكذا، فأخذ بقضاء رسول اللهؐ... وقال الحمد لله الذي جعل فينا من يحفظ عن نبيناؐ وإن أعياه ذلك دعا رؤوس المسلمين وعلماء هم فاستشارهم، فإذا اجتمع رأيهم على أمر قضى به. (سنن الکبریٰ: ۱۰/۱۹۶، احمد بن حسین ابوبکر البیہقی متوفی ۴۵۸ھ، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۴ھ)

ابوبکر صدیقؓ کے پاس جب کوئی مقدمہ درپیش ہوتا تو اس سے متعلق فیصلہ کو کتاب اللہ میں تلاش کرتے، کتاب اللہ میں فیصلہ پاتے تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے، اگر کتاب اللہ میں نہ پاتے تو سنت رسول میں تلاش کر کے دیکھتے کہ حضورﷺ سے اس سے متعلق کوئی فیصلہ ثابت ہے؟ اگر معلوم ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر سنت میں تلاش کرنے سے معلوم نہ ہوتا تو نکل آتے اور مسلمانوں سے دریافت کرتے کہ میرے پاس فلاں فلاں مقدمہ آیا ہے، میں نے اس سے متعلق کتاب اللہ و سنت رسول میں فیصلہ تلاش کیا، نہیں پایا، کیا تمھیں

اس سے متعلق حضور ﷺ کا کیا ہوا کوئی فیصلہ یاد ہے؟ کبھی لوگوں کے علم میں ہوتا وہ کھڑے ہوکر بتا دیتے کہ فلاں مسئلہ میں حضور ﷺ نے اس طرح فیصلہ کیا ہے، ابوبکر صدیقؓ حضور ﷺ کا وہ فیصلہ قبول کرتے اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اور اللہ کی تعریف بیان کرتے کہ ہمارے درمیان ایسے لوگوں کو جمع کیا جو حضور ﷺ کے فیصلوں کو محفوظ کئے ہوئے ہیں، اگر عاجز آجاتے یعنی کتاب اللہ میں بھی نہ پاتے اور نہ سنت میں اور نہ لوگوں میں تو مسلمان رؤساء اور ان کے علماء کو بلاتے اور اس مقدمہ سے متعلق ان سے مشورہ کرتے اجتماعی طور پر، جب ان علماء کی اس مقدمہ سے متعلق کسی حکم پر رائے متفق ہوجاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کردیتے۔

اجتماعی اجتہاد کے ایک اور واقعہ کو ابراہیم نخعیؒ نقل کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ کے دور میں پیش آیا تھا:

> قبض رسول اللهؐ والناس مختلفون في التكبير على الجنائز لا تشاء أن تسمع رجلا يقول سمعت رسول اللهؐ يكبر سبعا وآخر يقول: سمعت رسول اللهؐ يكبر خمسا وآخر يقول سمعت رسول الهؐ يكبر أربعا إلا سمعته، فاختلفوا فى ذلك، فكانوا على ذلك حتى قبض أبو بكرؓ فلما ولي عمرؓ رأى اختلاف الناس في ذلك، شق ذلك عليه جدًّا، فأرسل إلى رجال من أصحاب رسول الله فقال: إنكم معاشر أصحاب رسول اللهؐ متى تختلفون على الناس يختلفون من بعدكم ومتى تجتمعون على أمر يجتمع الناس عليه، فانظروا أمراً تجتمعون عليه فكأنما أيقظهم، فقالوا: نعم ما رأيت يا أمير المؤمنين، فأشر علينا، فقال عمرؓ: بل أشيروا أنتم عَلَيَّ فإنما أنا بشر مثلكم، فتراجعوا الأمر بينهم، فاجمعوا أمرهم على أن يجعلوا التكبير على الجنائز ... فأجمع أمرهم على ذلك. (شرح معانی الآثار، ص:

۳۱۹، باب التکبیر علی الجنائز کم ھو، ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی، متوفی: ۳۲۱ھ، مکتبہ اشرفیہ دیوبند)

اللہ کے رسولؐ دنیا سے پردہ فرما گئے، لوگ ابھی تکبیر علی الجنائز میں اختلاف کرر ہے تھے، کوئی راوی روایت کرتا کہ میں نے حضورؐ سے سنا کہ تکبیر علی الجنائز سات ہے، دوسرا روایت کرتا کہ میں نے سنا کہ پانچ تکبیرات ہیں، تیسرا روایت کرتا کہ چار تکبیرات ہیں، اس طرح یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان مختلف فیہ ہی تھا، حتی کہ ابو بکر صدیقؓ بھی انتقال کر گئے، جب عمرؓ خلیفہ بنے لوگوں کو اس اختلاف میں دیکھا تو آپ پر بہت شاق گذرا تو عمرؓ نے بعض صحابہ کرام کو بلوایا اور کہا تم تو اللہ کے رسولؐ کے صحابہ ہو، اس مسئلہ میں جب تمہارے درمیان اختلاف رہے گا تو تمہارے بعد کے لوگ بھی اس میں اختلاف کریں گے، جب تم کسی ایک حکم پر اتفاق کرلو گے تو لوگ بھی اس پر جم جائیں گے، لہٰذا کسی ایک حکم پر غور کرلو جس پر تم سب اتفاق کر سکیں، گویا حضرت عمرؓ صحابہ کو جگا رہے تھے، ان صحابہ کرامؓ نے جواب میں کہا کہ جی ہاں، اے امیر المؤمنین آپ جیسے مناسب سمجھیں ویسے ہی ہو، لہٰذا آپ ہمیں مشورہ دو، حضرت عمرؓ نے کہا نہیں، تم مجھے مشورہ دیجئے، یقیناً میں بھی آپ کی طرح ایک بشر ہو، جمع شدہ صحابہ نے حکم میں غور و فکر کر کے اس حکم پر اتفاق کرلیا کہ نماز جنازہ کی تکبیریں چار ہیں، اس طرح یہ حکم ان کے درمیان اتفاقی ہو گیا۔

صرف یہی دو مثالیں نہیں بلکہ دیگر صحابہ بھی اپنے اپنے دور میں جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جاتا یا نیا مسئلہ پیش آتا تو اجتماعی طور پر اس مسئلہ میں غور و فکر کرتے اس کو حل کر کے اس پر سب متفق ہو جاتے، چنانچہ مفتی تقی عثانی صاحب لکھتے ہیں:

هكذا كان الصحابةؓ يشاورون فيما بينهم لمعرفة الحكم الشرعي في مسألة جديدة أو لتقليل الخلاف في المسائل المختلف فيها، وهذا هو المقصود بالاجتهاد الجماعي. (الاجتہاد الجماعی، ص:

۸، مفتی تقی عثمانی)

اجتماعی اجتہاد ائمہ مجتہدین کا بھی عمل رہا ہے، چنانچہ کسی بھی فقہی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جمع ہوتے، مسئلہ پر غور وفکر کر کے ایک حکم پر اتفاق کر لیتے، اس سلسلہ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ امام صاحب اپنے شاگردوں کولیکر اجتماعی اجتہاد کی مجلس لگاتے بقول موفق مکیؒ کے ایک مسئلہ میں مہینہ مہینہ یا اس سے زیادہ اجتماعی طور پر غور وفکر کرتے پھر اس مسئلہ کو حل کرتے، مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

> وكذا الأئمة المجتهدون بعد عهد الصحابة كانوا يتشاورون فيما بينهم، وقد كوّن بعضهم من أجل ذلك مجلسا يجتمعون فيه ويتذاكرون المسائل الفقهية والذي اشتهر في هذا المنهج هو الإمام أبو حنيفة الذي جعل الاجتهاد شورى بين أصحابه، ويقول الموفق المكيؒ فوضع إمام الأنام مذهبه شورى بينهم ولم يستبد فيه بنفسه دونهم اجتهادا منه في الدين، ومبالغة في النصيحة لله تعالى ولرسوله وللمسلمين فكان يطرح مسألة ثم يسأل ما عندهم، ويقول ما عنده ويناظرهم في كل مسألة شهرا أو أكثر. (الاجتہاد الجماعی، ص:۹، مفتی تقی عثمانی)

ان روایات وتصریحات سے یہ بات واضح ہوئی کہ شریعت نے اجتماعی اجتہاد کی اجازت دے رکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ مذکورہ ادوار (عہد صحابہ وتابعین) میں اس پر عمل ہوتا رہا، کیوں کہ ضرورت بھی تھی اور دروازہ بھی کھلا تھا، ہمارے اس دور میں بھی ہوگا۔

لیکن فقہاء متقدمین سا اجتہاد نہیں ہوگا کہ نئے طور سے قواعد وضع کئے جائیں یا پھر ان کے استخراج کردہ جزئیات کا ازسرے نو استخراج کیا جائے، بلکہ ان جزئیات کو جن کا وقوع اس زمانہ میں نہیں ہوا تھا اور فقہاء نے اس کی تصریح نہیں فرمائی ہے ہم اجتماعی اجتہاد سے فقہاء کے قواعدِ مدونہ پر منطبق کریں گے اور فقہاء کے اصول سے حل کریں گے۔

مگر یہ بات یاد رکھیں کہ اجتماعیت کے اس طریقہ سے مسئلہ چاہے جس درو میں بھی حل کریں، مجلس کے شریک حضرات میں کچھ شرائط کا ہونا ضروری ہے، اگر مندرجہ ذیل شرائط نہیں پائے جائیں گے تو وہ آدمی اس مجلس میں شریک

نہیں ہوسکتا، اگر شریک کرلیا گیا تو مجلس قابلِ اعتماد نہیں رہے گی، کیوں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے جب حضرت علیؓ کو یہ طریقہ بتلایا تو فرمایا شاوروا الفقہاء والعابدین اس کی روشنی میں مفتی تقی صاحب حفظہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس طرح کی مجلس میں شریک ہونے والوں میں دو شرط کا پایا جانا ضروری ہے: (۱) شریک ہونے والا فقیہ ہو یعنی جس نے اپنے آپ کو تفقہ فی الدین کے لئے فارغ کردیا ہو، لہٰذا غیر فقیہ اس میں شریک نہیں ہوسکتا، (۲) شریک ہونے والا عابد ہو، کیوں کہ عبادت وتقویٰ ایسی چیزیں ہیں جو انسان میں حق وباطل کے درمیان تمیز کا ملکہ پیدا کرتی ہے، مفتی صاحب کی عبارت ملاحظہ ہو:

> قال رسول اللهﷺ لعلي بن أبي طالب: شاوروا الفقهاء والعابدين ... قد أوضح النبيﷺ في هذا الحديث أنه يجب أن يتوفر في مثل هذا الاجتهاد شرطان: أن يكون من قبل الفقهاء وهم الذين فرّغوا أنفسهم للتفقه في الدين، كما يقتضيه قول الله سبحانه وتعالى فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين (توبہ:۱۱۲)(۲) أن يكون من العابدين المتقين فإن العبادة والتقوى من أهم العناصر التي تكوّن في الإنسان ملكة تمييز بين الحق والباطل ويبعد عن مجازفة فى أحكام الله تعالى بمجرد التشهى قال الله تعالى إن تتقوا الله يجعلكم فرقانا. (انفال:۲۹)(الاجتہاد الجماعی:۱۲/ مفتی تقی عثمانی)

حکیم الامت کے قول سے تائید

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے دور حاضر میں ہونے والے اجتہاد کے حدود وقیود اور اس کے مواقع پر بڑی ہی چشم کشا بات ارشاد فرمائی ہے کہ:

> اجتہاد مطلق .... یعنی قواعد کا مقرر کرنا کسی کو جائز نہیں، نیز جن جزئیات کو فقہاءِ متقدمین مستخرج کرچکے ہیں، ان کا استخراج بھی اب جائز نہیں، کیوں کہ ضرورت نہیں رہی، البتہ جن جزئیات کا وقوع اُس زمانہ میں نہیں ہوا تھا اور فقہاء نے اس کی تصریح نہیں فرمائی، ایسے جزئیات کا انطباق ان کے قواعدِ مدونہ پر جائز ہے، اور ایسے لوگ ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں، ورنہ شریعت کو کامل نہیں کہہ سکیں گے،

اور جزئیہ منصوصہ کا استخراجِ جدید اس لئے جائز نہیں کہ حضراتِ سلف، علم میں، فراست میں، تقویٰ میں، زہد میں، جہد فی الدین میں، غرض سب باتوں میں ہم سے بڑھے ہوئے تھے تو تعارض کے وقت ان کا اجتہاد مقدم ہوگا باقی جزئیہ غیر منصوصہ میں اجتہاد کر کے عمل کرنا جائز ہے۔ (اجتہاد وتقلید کا آخری فیصلہ، ص: ۵۸، حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ، متوفی: ۱۳۶۲ھ، ادارہ افادات اشرفیہ لکھنؤ ۱۴۳۵ھ)

تقلیدِ شرعی اور علاّمہ اقبال

فکرِ اقبال میں تقلید کا مسئلہ بڑی اہمیت و مرکزیت کا حامل ہے، آزاد خیال اور مغرب زدہ طبقہ اپنے نظریہ پر علامہ اقبالؒ کے بھرپور حوالے دیتا ہے اور علامہ اقبال کو ماضی قریب میں انکارِ تقلید کے سب سے بڑے حامی کے طور پر پیش کرتا ہے، اس بارے سے علامہ اقبالؒ کا واقعی کیا نقطۂ نظر تھا؟ مختلف ادوار میں ان کا کیا موقف رہا؟ اور فکرِ اقبال نے اخیر میں کس سمت کروٹ لی، ان ساری چیزوں پر بحث کرنے کے لیے پہلے تقلید کا معنی و مفہوم، اس کی ضرورت اور اس کی شرعی حیثیت بھی قارئین کی نظر سے گذرنا ضروری ہے، تا کہ اس تعلق سے فکرِ اقبال کا صحیح تجزیہ کیا جاسکے۔

تقلید کی تعریف: محمد اعلیٰ بن علی التھانویؒ تقلید کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> التقليد اتباع الإنسان غيره فيما يقول أو يفعل معتقدا للحقيّة من غير نظر إلى الدليل كأن هذا المتبع جعل قول الغير أو فعله قلادة في عنقه من غير مطالبة دليل. (کشاف اصطلاح الفنون والعلوم: ۱/۵۰۰، محمد اعلی بن علی التھانوی، متوفی: ۱۱۵۸ھ، مکتبہ لبنان ۱۹۹۶ء)
>
> تقلید کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی دوسرے کے قول یا فعل میں محض حسنِ عقیدت سے اس کی اتباع کرے، اس کو حق سمجھتے ہوئے، بغیر دلیل کے ملاحظہ کرنے کے، گویا اس اتباع کرنے والے نے غیر کے قول یا اس کے فعل کو بغیر دلیل کے مطالبہ کے اپنے گلے کا ہار بنالیا ہے۔

عبد الغنی نابلسیؒ تقلید کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> إن التقليد هو قبول قول الغير من غير معرفة دليله. (خلاصة التحقیق فی بیان حکم التقلید والتلفیق، ص: ۵، عبد الغنی النابلسی، متوفی: ۱۱۴۳ھ، مکتبہ

الحقیقۃ، ترکیا،۱۴۳۲ھ)

تقلید یہ ہے کہ غیر کے قول کو قبول کر لینا دلیل کا مطالبہ کئے بغیر۔

تقلید کی ضرورت

یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان کا دنیا میں آنے کا مقصد اللہ کی اطاعت اور اس کو راضی کرنا ہے، جیسے کہ قرآن پاک کی آیت ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات:۵۶) یہ بات بھی مسلم ہے کہ حقیقی معنی میں اللہ کی اطاعت اور اس کی رضامندی حاصل تب ہوگی جب دین کے ہر ہر شعبہ میں اس کی مرضی کے مطابق عمل کیا جائے، قرآن وسنت میں بیان کردہ احکام دو قسم کے ہیں: (۱) جن کے معانی ومفہوم واضح ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

> وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُم بَعْضاً. (حجرات:۱۲) اور برا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو

اس آیت کے معنی واضح ہے، ہر کوئی سمجھ سکتا ہے (۲) جن کے معانی ومفہوم کچھ دقیق ہیں، جن کو ہر کوئی سمجھ نہیں سکتا، جیسے قرآن پاک کی آیت:

> وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ. (بقرہ:۲۲۸)
>
> طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین قروء تک۔

اس آیت میں قروء سے کیا مراد ہے، حیض یا طہر، ہر کوئی سمجھ نہیں سکتا، الغرض جو آیات واضح ہیں ان کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے، اس مسئلہ میں قرآن وسنت کے مطابق عمل کر سکتا ہے، لیکن دوسری قسم کے احکام (جن کی بھی کافی تعداد ہے) کے معانی ومفہوم کچھ دقیق ہیں ہر کوئی سمجھ نہیں سکتا، اوروں کی بات تو رہی بسا اوقات خود صحابہ تک نہیں سمجھ سکے، جب کہ ان کی زبان عربی تھی، قرآن بھی نازل ہوا تھا، عربی ہی میں، حضرت عدی بن حاتمؓ روایت کرتے ہیں:

> جب آیت وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ ہمارے سامنے بیان کی گئی تو میں نے ظاہر آیت پر عمل کرتے ہوئے، دو رسیاں لی، جس میں ایک کالے رنگ کی تھی ایک سفید رنگ کی تھی، ان دونوں کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھا اور سو گیا، پھر سحر میں اٹھ کر کھاتا رہا، یہ دیکھتے ہوئے کہ کالی رسی سفید ہوگئی یا نہیں، صبح تو ہوگئی لیکن رسیاں اپنے ہی رنگ میں باقی ہیں، تو میں نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ سنایا، تو اللہ کے

نبی ﷺ نے مجھے آیت کا صحیح معنی ومفہوم بتلایا۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/۲۴۱، حافظ عماد الدین ابوالفداء ابن کثیر، مکتبہ قدوسیہ، سن ۲۰۰۶ء)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھار صحابہ کرام بھی قرآن پاک کے معانی ومفہوم خود سے نہیں سمجھ پائے، بلکہ حضور ﷺ سے رجوع ہوئے اور ان کے معنی کو سمجھا، ایسے ہی اس دور میں قرآن وسنت کے صحیح معنی سمجھنے کے لئے اور دین کے ہر ہر شعبہ میں خدا کی مرضی کے مطابق عمل کرنے کے لئے ہمیں خدا کے اُن برگزیدہ بندوں کی جنھوں نے قرآن وسنت وشریعت کو صحیح سمجھا اور سمجھایا، متابعت کرنی ہوگی، ان کی تقلید کرنی ہوگی، ان کی تقلید کئے بغیر نہ ہم قرآن وسنت صحیح سمجھ پائیں گے نہ اُن قرآنی آیات واحادیث سے مستنبط ہونے والے احکام سے مطلع ہو پائیں گے، اس لئے تقلید کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے متابعت کی ضرورت پڑتی ہے، مفتی شفیع صاحب پاکستانیؒ لکھتے ہیں:

> تقلید کا حال علومِ دینیہ میں بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ علومِ دنیویہ، طب وریاضی وہیئت کا اور دست کاریوں مثل نجاری ومعماری وغیرہ کا کہ ناواقف کو بدون تقلید کسی واقف کے چارہ نہیں، ایسے ہی علومِ دینیہ میں ناواقف کو بدونِ تقلیدِ واقف کے چارہ نہیں۔ (جواہر الفقہ: ۲/۲۹، مفتی شفیع صاحب، پاکستانی، متوفی: ۱۳۹۶ھ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۳۴۱ھ)

تقلید حضور ﷺ اور صحابہؓ کے دور سے ہی رہی ہے

ایک اور بات واضح کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ تقلید صرف ہمارے دور کی پیداوار نہیں ہے اور نہ ہی چوتھی صدی کی پیداوار ہے، تقلید کے نمونے تو صحابہ کے دور میں بھی موجود تھے، اس کا انکار کرنا مسلّمات سے انکار کے مترادف ہے، کیوں کہ تقلید کا حاصل یہ ہے کہ جس کا قول حجت ہے، اس کی ماننا تقلید نہیں کہلاتی اور جس کا قول حجت نہیں ہے اس کی ماننا تقلید کہلاتی ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری حنفیؒ لکھتے ہیں:

> التقليد العمل بقول من ليس قوله إحدى الحجج بلا حجة منها. (فتح الغفار شرح المنار، ص: ۳۹۴، علامہ زین الدین ابن نجیم، متوفی: ۹۷۰ھ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۲ھ)
>
> تقلید کہتے ہیں اس شخص کے قول پر عمل کرنا جس کا قول حجت نہ ہو، اس کے قول پر

دلیل مانگے بغیر۔

اس قاعدہ وتعریف کے مطابق حضورﷺ جب تک رہے، آپﷺ سے معلوم کرکے مسائل پر جو عمل کیا گیا یہ تقلید نہیں تھی، کیوں کہ آپﷺ کا قول ہمارے حق میں حجت ہے، باقی حضورؐ کے جانے کے بعد یا آپﷺ کے ہوتے ہوئے صحابہؓ کا آپس میں مسئلہ معلوم کرکے عمل کرنا یہ تقلید ہی تو ہے، (کیوں کہ صحابہ کے لئے آپس میں ایک دوسرے کا قول حجت نہیں ہے) اب قارئین خود فیصلہ کریں کہ تقلید کب کی پیدوار ہے اور کب سے شروع ہوئی ہے۔

اختصار کے پیش نظر صحابہ کے دور میں تقلید کی صرف ایک مثال بیان کرنا چاہتا ہوں:

> حضرت سالمؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے شخص پر کچھ میعادی قرض واجب ہے اور صاحبِ حق اس میں سے کسی قدر اس شرط پر معاف کرتا ہے کہ وہ دَین کو میعاد سے پہلے ادا کردے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اس کو مکروہ (ناپسند) قرار دیا، اور اس سے منع فرمایا۔
>
> عن سالم بن عبد الله عن عبد الله بن عمرؓ أنه سئل عن رجل يكون له الدين على الرجل إلى أجل فيضع عنه صاحب الحق ويعجله الآخر فكره ذلك عبد الله بن عمرؓ ونهى عنه. (مؤطا مالک، رقم الحدیث: ۲۴۷۹، باب ماجاء فی الربا فی الدین، مالک بن انس المدنی، متوفی: ۱۷۹ھ، ناشر: مؤسسة زاید بن سلطان، ابوظبی الامارات، ۱۴۲۵ھ)

یہ مثال اس بات میں واضح ہے کہ تقلید صرف ہمارے دور کی یا چوتھی صدی کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ حضورﷺ اور صحابہؓ کے دور سے ہی شروع ہوگئی تھی، لہٰذا ہمیں اس طرح کے باطل نظریات کو اپنے ذہن سے ختم کرکے اپنے واجبی عمل کو پورے طور پر بجالانا چاہئے۔

تقلید کا حکم

تقلید دو طرح کی ہوتی ہے: ایک مطلق، دوسری شخصی، ان کے شرعی احکام پر بحث کرتے ہوئے مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> مطلق تقلید بنصِ قرآنی فرض ہے۔
>
> فَاسۡأَلُوا أَهۡلَ الذِّكۡرِ إِن كُنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ. (نحل:۴۳)

اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل علم سے دریافت کرلو۔

أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ. (نساء:۵۹)

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، رسول اللہ کی اطاعت کرو، اور اولوالامر کی اطاعت۔

اس طرح کی آیات کی بنیاد پر مطلق تقلید فرض ہے، رہی بات تقلید شخصی کے حکم کی، تو لکھتے ہیں:

> تقلید شخصی باجماع اہل سنت والجماعت واجب ہے۔ (جواھر الفقہ :۱۸/۲، مفتی شفیع، متوفی: ۱۳۹۶ھ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۳۴۱ھ)

موجودہ دور میں کونسی تقلید واجب اور اس کی مصلحت؟

تقلید تو عہد صحابہ اور عہد تابعین میں اپنے اپنے اختیار سے ہوئی، یعنی مطلق تقلید و تقلید شخصی دونوں ہوئی، لیکن دوسری صدی کے بعد جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا طبیعتوں میں نفس پرستی بڑھتی گئی، جس طرح عدمِ تقلید کی صورت میں فساد کا اندیشہ تھا، اب مطلق تقلید کی صورت میں بھی فساد کا اندیشہ ہونے لگا، اس طور پر کہ آدمی اپنی غرض کے مطابق ائمہ کی تقلید کرنے لگے گا تو اربابِ فقہ نے اجماع منعقد کر کے یہ بات واجب کردی کہ آدمی کسی معین مذہب ہی کی تقلید کرے گا، مطلق تقلید نہیں کرے گا، اس طرح دوسری صدی کے بعد سے تقلید شخصی کو واجب و لازم کردیا گیا، چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> وبعد المأتين ظهر فيهم ا لتمذهب بالمجتهدين بأعيانهم وكان هذا هو الواجب في ذلك الزمان. (الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ص: ۷۰، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، متوفی: ۱۱۷۶ھ، دار النفائس بیروت، ۱۴۰۴ھ)
>
> دوسری صدی کے بعد لوگوں میں متعینہ مذہب کی تقلید ظاہر ہو چکی تھی اور اس وقت یہی چیز واجب تھی۔

شاہ صاحب کے قول سے معلوم ہوا کہ دوسری صدی کے بعد سے ہی تقلید شخصی واجب ہو چکی ہے، لہٰذا اس دور میں بھی تقلید شخصی ہی ہوگی اور تقلید شخصی کرنے کی صورت میں ہی اتباع ہوائے نفس سے بچنے کی قوی امید ہے، ورنہ آدمی قرآن وسنت کے مطابق مسائل پر عمل نہیں کرے گا، بلکہ قرآن وسنت وائمہ کی آڑ میں اپنے خواہش کے مطابق عمل کرے گا جو کہ باتفاق امت واجماع جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ تقلید مطلق کے مفاسد و نتائج پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> في وقت يقلدون من يفسده وفي وقت يقلدون من يصححه بحسب الغرض والهوى ومثل هذا لا يجوز باتفاق الأمة ... فإن هذا لا يجوز بالإجماع ... لأن ذلك يفتح باب التلاعب بالدين ويفتح الذريعة إلى أن يكون التحريم والتحيل بحسب الأهواء. (الفتاویٰ الکبریٰ: ۲۰۴/۳، باب تزوج امرأۃ من سنین ثم، تقی الدین ابو العباس، ابن تیمیہ، متوفی: ۷۲۸ھ، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۸ھ)
>
> ایک وقت میں اس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے، اور دوسرے وقت میں اس امام کی جو اس کو صحیح قرار دیتا ہے اور یہ محض اپنی غرض و ہویٰ کی وجہ سے ہے، ایسا کرنا باتفاق امت ناجائز ہے... یہ باجماعِ مسلمین جائز نہیں ہے... کیوں کہ یہ دین کو کھلونا بنانے کا دروازہ کھولنا ہے اور یہ سبب بنتا ہے کہ حلال وحرام کا مدار محض اہواء وخواہشات پر ہو جائے۔

امت کو تقلید شخصی کا پابند بنانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے امام نوویؒ لکھتے ہیں:

> وجهه أنه لو جاز اتباع مذهب شاء لأفضى إلى أن يلتقط رُخَصَ المذاهب متبعا هواه ويتخير بين التحليل والتحريم والوجوب والجواز وذلك يؤدى إلى انحلال رِبقة التكليف ... فعلى هذا يلزمه أن يجتهد في اختيار مذهب يقلده على التعيين. (المجموع شرح المہذب: ۸۸/۱ ابوزکریا محی الدین النووی، متوفی: ۶۷۶ھ، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع ۱۴۱۷ھ)

اس اقباس میں بھی علامہ نوویؒ نے یہی بیان کیا کہ اس دور میں مطلق تقلید کی اجازت دینے کی صورت میں اپنی غرض کے مطابق حلت، حرمت، وجوب، وجواز کو اختیار کیا جائے گا، جس سے دین کا مذاق لازم آئے گا، لہٰذا اس دور میں کسی ایک معین مکتب فکر کا پابند بن کر تقلید شخصی کرنا ہی واجب ولازم ہے۔

تقلید سے متعلق علامہ کا نظریہ

علامہ اقبالؒ نے امت پر طاری جمود کو دیکھ کر اور ان ملکوں کی ترقی کو دیکھ کر جنھوں نے آزادئ رائے کا نظریہ اختیار کیا تھا، خود بھی آزادئ اجتہاد کا نظریہ اختیار کر لیا تھا، اور اس کو ضروری بھی قرار دیا تھا اور حتی الامکان اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن اخیر دور میں جب علامہ پر حقیقت کھل گئی کہ اِس آزادی اجتہاد کو عملی جامہ پہنانے سے ملت میں انتشار پیدا ہو جائے گا، امت کی مرکزیت ختم ہو جائے گی، خواہش پرستی غالب آ جائے گی تو علامہؒ نے اپنا نظریہ تبدیل کر کے پھر سے تقلیدِ مجتہدین کا نظریہ اپنا لیا اور لوگوں کو بھی اسی کی ترغیب دی کہ گذرے ہوئے فقہاء کے مذاہب کے حدود میں رہتے ہوئے شریعت پر عمل کرنے میں ہی عافیت اور مصلحت ہے۔ (محمد اسد- بندۂ صحرائی خودنوشت سوانح عمری، ۱۹۳۲-۱۹۹۲ء، ص: ۵۹، محمد اسد پولا حمیدہ اسد، ناشر دی ٹروتھ سوسائٹی، لاہور)

علامہ کا نظریۂ تقلید در اشعار فارسی و اردو

علامہ کا نظریۂ تقلید جس طرح واقعات وغیرہ سے واضح ہوتا ہے ایسے ہی علامہ کے اِن اشعار سے بھی واضح ہوتا ہے جس میں علامہ امت کو تقلید کی اور اسلاف کے مذاہب و مجتہَدات پر یقین کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں، علامہ کے اشعار یوں ہیں:

نقش بر دل معنئ توحید کن ☆ چارۂ کارِ خود از تقلید کن
اجتہاد اندر زمان انحطاط ☆ قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زاجتہاد عالمان کم نظر ☆ اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
عقل آبایت ہوس فرسودہ نیست ☆ کار پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکر شاں رسید ہے باریک تر ☆ ورعِ شاں با مصطفیٰ نزدیک تر
ذوق جعفر کاوشِ رازی نماند ☆ آبروئے ملت تازی نماند

(مثنوی رموزِ بیخودی، ص: ۶۳، ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، متوفی: ۱۹۳۸ھ، در یونین سٹیم لاہور)

تقلید پر کہے ہوئے علامہ کے اشعار کا منظوم اردو ترجمہ کرتے ہوئے جناب کوکب شادانی صاحب کہتے ہیں:

نقش دل پر معنیٔ توحید کر ☆ غم نہ کر اسلاف کی تقلید کر
اجتہاد اپنا بہ دور انحطاط ☆ خود اُلٹ دیتا ہے ملت کی بساط
اجتہادِ خام سے ہے سر بسر ☆ اقتدائے رفتگاں محفوظ تر
عقل ان کی حرص فرسودہ نہ تھی ☆ مقصدِ ذاتی سے آلودہ نہ تھی
تھی نگاہِ رفتگاں باریک بیں ☆ زُہد تھا زہدِ رسالت کے قریں
اب وہ شان ملتِ تازی کہاں! ☆ ذوقِ جعفر کاوشِ رازی کہاں
مضمحل ہوجائے جب نظمِ حیات ☆ قوم کو تقلید دیتی ہے ثبات
ہے راہِ اسلاف جمعیت تری ☆ مسلکِ تقلید ہے طاقت تری

(رموز بیخودی (ترجمہ) کوکب شادانی، ص:۴۶)

میں سمجھتا ہوں کہ علامہ کے ان اشعار کو مطالعہ کرنے کے بعد قارئین کرام پر علامہ اقبالؒ کا نظریۂ تقلید واضح ہو چکا ہوگا، یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ علامہ اقبال تقلید کا نظریہ بنا کر خاموش نہیں بیٹھ گئے، بلکہ امت کو اس کی دعوت بھی دیتے رہے اور ہمت افزائی بھی کرتے رہے اور راہ اسلاف کو اپنانے پر ابھارتے رہے، ان اشعار میں اتنا تو واضح ہوا کہ علامہ کا نظریۂ تقلید کا تھا، لیکن یہ واضح نہیں ہوا کہ یہ نظریہ اخیر دور کا ہے یا پہلے کا؟

علامہ کا نظریۂ تقلید ایک واقعہ سے

اس موقع پر راقم الحروف علامہ موصوف کا ایک ایسا واقعہ پیش کرنے جا رہا ہے جس سے واضح ہو جائے گا کہ علامہ کا نظریہ اخیر دور میں تقلید ہی کا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ اس واقعہ سے بڑھ کر کوئی دلیل ہو نہیں سکتی، یہ واقعہ ایسا ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، میں اس واقعہ کو خود صاحب واقعہ سے انہی کے الفاظ میں بیان کروں گا، یہ واقعہ ۱۹۳۴ء کا ہے اور علامہ کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا ہے، صاحب واقعہ محمد اسد صاحب لکھتے ہیں:

> لوگ بڑی تعداد میں میرے پاس آنے لگے اور دہلی، بمبئی اور مدراس میں خطاب کرنے کی درخواستیں کرنے لگے، میرے لئے ان تمام دعوتوں کو قبول کرنا ممکن

نہیں تھا، اس لئے میں نے ایک اور راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ یہ تھا کہ ان دونوں لیکچروں کو قطع و برید اور اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کرا دیا جائے، یوں کسی بھی اسلامی موضوع پر میری اولین کتاب ''اسلام دوراہے پر'' ۱۹۳۴ء کے آغاز میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی... اُس وقت ہندی مسلمانوں میں محمد اقبال کا نام جادوئی تاثیر کا حامل تھا،... میرے کان ان کے نام سے آشنا تھے، لیکن بد قسمتی سے مجھے ابھی تک ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا... میرے توقعات نے مجھے مایوس نہیں کیا، جب میں شام کو الٰہی بخش کے گھر کی بیٹھک میں داخل ہوا، اس وقت اقبال ہر عمر کے درجن بھر اصحاب میں گھیرے ہوئے قالین پر بیٹھے تھے، اور پر سکون خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے، تھوڑی دیر کے لئے میری آمد نے ان کی توجہ میں خلل ڈالا، لیکن باہمی تعارف کے کچھ لمحات کے بعد اقبال نے اپنی گفتگو کو وہیں سے شروع کیا، جہاں سے چھوڑا تھا، سامعین پھر ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس وقت وہ اسلامی تاریخ کے کسی پرانے دور کا ذکر کر رہے تھے، ان کا اندازِ تخاطب ثقہ اصحاب کے بجائے ایسے اساتذہ جیسا تھا جو ہر بات آسان پیرائے میں اپنے طالب علموں کو سمجھا رہا ہو، وہ فرش پر جوکڑی جمائے بیٹھے تھے، دیوار کے ساتھ رکھے سرہانے سے ٹیک لگا رکھی تھی اور دھیمی آواز میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے، وہ بخوبی جانتے تھے کہ سامعین ان کی گفتگو پورے انہماک اور دلچسپی سے سن رہے ہیں، اچانک انہوں نے اپنی گفتگو روک کر مجھے مخاطب کیا کہ میں آپ کی کتاب ''اسلام دوراہے پر'' پڑھ چکا ہوں اور آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ مجھے پسند ہے، صرف مجھے آپ کے تصوّرِ اجتہاد سے اختلاف ہے، یقیناً اجتہاد فی نفسہ اہم اور مفید ہے، لیکن جس انحطاطی دور سے ہم گذر رہے ہیں اس میں یہ قدرے خطرناک ہے، میری رائے میں اس سے اسلام میں نظریاتی اور فروعی اختلافات میں اضافہ ہوگا، اس سے ذہنی و فکری انتشار بڑھے گا اور بالآخر اس سے ہمارے

معاشرتی ڈھانچہ کا تانا بانا بکھر کر رہ جائے گا۔ (محمد اسد- بندۂ صحرائی خودنوشت سوانح عمری، ۱۹۳۲-۱۹۹۲ء، ص: ۵۹، محمد اسد پولا حمیدہ اسد، ناشر دی ٹروتھ سوسائٹی، لاہور)

اس واقعہ کے مطالعہ کے بعد قارئین کرام پر علامہ کا نظریہ واضح ہوگیا ہوگا اور یہ بات بھی یقینی ہوگئی ہوگی کہ واقعتاً علامہ نے اخیر دور میں اپنے نظریۂ اجتہاد سے رجوع کرلیا تھا اور تقلید کا نظریہ بنالیا تھا، اور یہ بات بھی واضح ہوگئی ہوگی کہ علامہ نے تقلید کی طرف مراجعت بغیر کسی وجہ کے ایسے ہی نہیں کی، بلکہ کچھ حقیقی وجوہات تھیں، جن کو علامہ خود مذکورہ واقعہ میں بیان کر چکے ہیں اور تقریباً یہی وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر امت میں اجتہاد کے دروازہ کو بند کر کے تقلید کا پابند بنادیا گیا ہے۔

علامہ کے رجوع الی التقلید کی وجہ

علامہ نے اپنے اشعار اور واقعہ میں رجوع الی التقلید کی وجہ کو کھلے بندوں واضح کر دیا کہ یہ وہ دور چل رہا ہے جس دور میں اہلیتِ اجتہاد، قابلیتِ اجتہاد، کسی میں پایا جانا ممکن نہیں ہے، یہ وہ دور ہے جس میں اجتہاد مفید نہیں، بلکہ مضر ہے، یہ وہ دور ہے جس دور میں بابِ اجتہاد کھولنے سے ملت میں انتشار پیدا ہوگا، امت کی مرکزیت ختم ہوجائے گی، امت کو قرآن وسنت سے مستنبط ہونے والے احکامِ صحیحہ پر جمع کرنا اور ان کا پابند بنانا مشکل ہوجائے گا، جب علامہ کو یہ سب حقائق سمجھ میں آگئی تو علامہ نظریۂ اجتہاد کو ختم کر کے تقلید کا نظریہ اپنالیا۔

علامہ اقبال اور ائمہ اربعہ کی تقلید

علامہ جن دنوں اجتہاد کے قائل تھے، تو چار ائمہ میں تقلید کے انحصار سے متعلق نظریہ کچھ الگ اختیار کیا تھا، جیسا کہ ہم نے پیچھے بیان کیا، لیکن اخیر دور میں جب تقلید کے قائل ہوئے تو ائمہ اربعہ کی تقلید سے متعلق نظریہ بھی بدل لیا اور جمہور امت کی رائے سے اتفاق کرلیا کہ اس دور میں اجتہاد کے اہل وقابل کا وجود ناممکن ہے، لہٰذا عافیت وسلامتی اسی میں ہے کہ صرف ان چار ائمہ کی تقلید کی جائے، ان کے علاوہ کسی پانچویں عالمِ کم نظر کی تقلید نہ کی جائے گی، کیوں کہ اس طرح کے علماء کی تقلید سے ملت کی بساط الٹ جائے گی، اسلام کی امتیازیت ختم ہوجائے گی، لہٰذا اسلاف (ائمہ اربعہ) ہی کی تقلید کو مضبوط تھام لیں، اسی رائے کو علامہ اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

نقش بر دل معنیٔ توحید کن ☆ چارۂ کارِ خود از تقلید کن

اجتہاد اندر زمان انحطاط ☆ قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زاجتہاد عالمان کم نظر ☆ اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
فکرِ شاں رسید ہمے باریک تر ☆ ورعِ شاں با مصطفیٰ نزدیک تر

(مثنوی رموز بیخودی، ص:۶۳، ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، متوفی: ۱۹۳۸ھ، دریونین سٹیم لاہور)

اس نظریہ پر لکھے ہوئے علامہ کے اشعار کا ترجمہ کوکب شادانی صاحب یوں کرتے ہیں:

نقش دل پر معنئ توحید کر ☆ غم نہ کر اسلاف کی تقلید کر
اجتہاد اپنا بہ دور انحطاط ☆ خود الٹ دیتا ہے ملت کی بساط
اجتہادِ خام سے ہے سر بسر ☆ اقتدائے رفتگاں محفوظ تر
مضمحل ہوجائے جب نظمِ حیات ☆ قوم کو تقلید دیتی ہے ثبات
ہے راہِ اسلاف جمعیت تری ☆ مسلکِ تقلید ہے طاقت تری

(رموز بیخودی (ترجمہ) ص:۴۶، کوکب شادانی)

میرے خیال کے مطابق علامہ نے ان اشعار میں واضح کردیا کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی مقتدیٰ کی تقلید نہیں کی جائے گی، نیز ائمہ اربعہ کی تقلید میں ہی امت کی مرکزیت محفوظ رہے گی، یہی رائے جمہور امت کی بھی ہے، چنانچہ ابن حجر مکیؒ فرماتے ہیں:

أما في زماننا فقال ائمتنا لا يجوز تقليد غير الأئمة الأربعة: الشافعي ومالك وأبي حنيفة وأحمد بن حنبل رضوان الله تعالىٰ. (فتح المبین شرح الاربعین، ص:۴۷۴، ابن حجر الہیثمی الشافعی، متوفی: ۹۷۴ھ، دارالمنہاج للنشر والتوزیع ۱۴۲۸ھ)

ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ ہمارے اس دور میں ائمہ اربعہ یعنی شافعیؒ، مالکؒ، ابوحنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ کے علاوہ کسی کی تقلید جائز نہیں ہے۔

ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی اور کی تقلید کے سلسلہ میں علامہ طحطاویؒ لکھتے ہیں:

من كان خارجا عن هذا الأربعة فهو من أهل البدعة

والنار۔ (طحطاوی علی الدر المختار بحوالہ جواھر الفقہ: ۳۱/۲، مفتی شفیع صاحب، متوفی: ۱۳۹۶ھ مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۳۴۱ھ)

جو اِن چار مذاہب سے نکل گیا وہ اہل بدعت والنار میں سے ہے۔

اس عبارت میں علامہ طحطاویؒ نے بڑی شدت سے بیان کیا ہے کہ جو ان چار مذاہب سے خروج کر کے کسی پانچویں کی تقلید کرتا ہے وہ اہل سنت والجماعت کے دائرہ سے نکل کر اہل بدعت والنار کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے، مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

ولما اندرست المذاهب الحقة إلا هذه الأربعة كأن اتباعها اتباعا للسواد الأعظم، والخروج عنها خروجا عن السواد الأعظم. (عقد الجید، ص: ۴۱، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، متوفی: ۱۱۷۶ھ، دار الفتح الشارقۃ ۱۴۱۵ھ)

جب مذاہب حقہ ان چار میں منحصر ہو گئے تو ان کی اتباع سواد اعظم کی اتباع ہے، ان سے خروج کر کے کسی پانچویں کی اتباع سوادِ اعظم سے خروج ہے۔

خاتمۂ کلام

مسئلہ تقلید واجتہاد کی حقیقت پر اپنی بساط کی حد تک علامہ اقبال کے افکار وخیالات کا غیر جانبدارانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی کہ خود علامہ کی تحریرات اور ان ہی کے کلام سے اس مسئلہ میں ان کے موقف کی تحقیق کی جائے، اب اخیر میں ہم یہ دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ تقلید ہو یا اجتہاد دونوں سے متعلق وہی نظریہ رکھیں جو متقدمین فقہاء کا تھا، اجتہاد سے متعلق متقدمین اور فقہائے امت کی رائے اجتہاد کے دروازہ کے بند ہونے کی تھی، ہمیں بھی چاہئے کہ وہی نظریہ اپنائیں، اور تقلید سے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ اس دور میں ہر انسان اس کا مکلّف ہے، لہٰذا ہمیں بھی یہی راہ اپناتے ہوئے کسی معین مذہب کے دائرہ میں رہ کر دین وشریعت پر عمل کرنا چاہئے، ہمارے بیان کرنے کے مطابق علامہ اقبالؒ کی بھی اخیر دنوں میں یہی رائے تھی اور یہی خواہش تھی، لوگوں کو بھی وہ اسی کی ترغیب دیتے تھے اور اسی پر ابھارتے تھے، لہٰذا معتدلانہ ومنصفانہ نظریہ اپناتے ہوئے دین وشریعت کے حدود میں رہیں، ورنہ غیر محسوس طریقہ سے انسان صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے جیسا کہ ہمارا مشاہدہ بھی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعاء گو ہوں کہ اس مقالہ کو عند الناس والعلماء قبولیت سے نوازے، لکھنے اور پڑھنے والے

کو عمل کی توفیق نصیب فرمائے، اس حقیر سی تحریر کے صدقہ میں خاتمہ بالخیر نصیب فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، آمین۔ والله الهادي إلى سبيل الرشاد.

مراجع

(۱) قرآن کریم

(۲) الجامع لاحکام القرآن تفسیر قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، متوفی ۶۷۱ھ، دار الکتب المصریہ القاہرہ، ۱۳۸۴ھ

(۳) مؤطا مالک، مالک بن انس المدنی، متوفی ۱۷۹ھ، ناشر مؤسسۃ زاید بن سلطان، ابوظبی الامارات، ۱۴۲۵ھ

(۴) شرح معانی الآثار، ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی، متوفی ۳۲۱ھ، مکتبہ اشرفیہ دیوبند

(۵) المعجم الاوسط، سلیمان بن احمد ابو القاسم الطبرانی، متوفی ۳۶۰ھ، دار الحرمین القاہرہ، ۱۴۱۵ھ

(۶) سنن الکبریٰ للبیہقی، احمد بن حسین ابوبکر البیہقی، متوفی ۴۵۸ھ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ

(۷) نقض المنطق، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، متوفی ۷۲۸ھ، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ، ۱۹۵۱ء

(۸) خلاصۃ التحقیق فی بیان حکم التقلید والتلفیق، عبد الغنی النابلسی، متوفی ۱۱۴۳ھ، مطبعۃ الحقیقیہ ترکیا، ۱۴۳۲ھ

(۹) کشاف اصطلاح الفنون والعلوم، محمد بن علی التھانوی، متوفی ۱۱۵۸ھ، مکتبہ لبنان، ۱۹۹۶ء

(۱۰) فتح الغفار شرح المنار، علامہ زین الدین ابن نجیم، متوفی ۹۷۰ھ، دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان ۱۴۲۲ھ

(۱۱) شرح السنۃ للبغوی، ابو محمد حسین البغوی، متوفی ۵۱۶ھ، المکتب الاسلامی دمشق، بیروت، ۱۴۰۳ھ

(۱۲) المجموع شرح المھذب، ابو زکریا محی الدین النووی، متوفی ۶۷۶ھ، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، ۱۴۱۷ھ

(۱۳) معالم اصول الفقہ عند اھل السنۃ والجماعۃ، محمد بن حسین بن حسن الجیزانی، مکتبہ دار ابن الجوزی ۱۴۲۷ھ

(۱۴) تاریخ ابن خلدون، عبد الرحمٰن بن محمد، ابن خلدون، متوفی ۸۰۸ھ، دار الفکر بیروت، ۱۴۰۸ھ

(۱۵) الفتاوی الکبری، تقی الدین ابو العباس، ابن تیمیہ حنبلی دمشقی، متوفی ۷۲۸ھ، دار الکتب العلمیہ ۱۴۰۸ھ

(۱۶) فتح المبین شرح الاربعین، ابن حجر الہیثمی الشافعی، متوفی ۹۷۴ھ، دار المنہاج للنشر والتوزیع، ۱۴۲۸ھ

(۱۷) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، متوفی ۱۱۷۶ھ، دار النفائس، بیروت،

۱۴۰۴ھ

(۱۸) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، متوفی ۱۱۷۶ھ، دار الفتح الشارقہ، ۱۹۹۵ء

(۱۹) الاجتہاد الجماعی، شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ

(۲۰) شرح عقود رسم المفتی، محمد امین بن عمر، ابن عابدین، متوفی ۱۲۵۲ھ، مکتبہ زکریا بکڈپو دیوبند، ۱۴۲۱ھ

(۲۱) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، متوفی ۱۱۷۶ھ

(۲۲) الکلام المفید فی اثبات التقلید، سرفراز خان صفدر صاحبؒ، مکتبہ دار العلوم دیوبند، ۲۰۱۴ء

(۲۳) تاریخ اسلام، اکبر شاہ خان نجیب آبادی، دار اندلس، ۱۴۲۶ھ

(۲۴) اجتہاد و تقلید کا آخری فیصلہ، حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ، متوفی ۱۳۶۲ھ، ادارہ افادات اشرفیہ لکھنؤ، ۱۴۳۵ھ

(۲۵) رموز بیخودی، علامہ اقبال صاحبؒ، متوفی ۱۹۳۸ء، در یونین سٹیم پریس لاہور

(۲۶) رموز بیخودی (ترجمہ) کوکب شادانی

(۲۷) تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، خطبات اقبال، مترجم سید نذیر نیازی، اسلامک بک سینٹر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء

(۲۸) عصر حاضر میں اجتماعی اجتھاد ایک تجزیاتی مطالعہ، حافظ محمد زبیر، شیخ زائد اسلامک سینٹر لاہور، ۲۰۱۰ء

(۲۹) تجدید فکریاتِ اسلام، ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۲ء

(۳۰) نقوش اقبال، مولانا ابوالحسن علی ندوی، متوفی ۱۴۲۰ھ، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، ۱۴۳۱ھ

(۳۱) فکر اقبال مقالات حیدر آباد سمینار، سعید احمد اکبر آبادی، کل ہند اقبال صدی تقاریب کمیٹی حیدر آباد، ۱۹۷۷ء

(۳۲) محمد اسد - بندۂ صحرائی، خودنوشت سوانح عمری ۱۹۳۲ء-۱۹۹۲ء، محمد اسد پولا حمیدہ اسد، ناشر دی ٹروتھ سوسائٹی، لاہور

(۳۳) جواھر الفقہ، مفتی شفیع صاحب پاکستانی، متوفی ۱۳۹۶ھ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۳۴۱ھ

(۳۴) تفسیر ابن کثیر، حافظ عماد الدین ابوالفداء ابن کثیر، مکتبہ قدّوسیہ، ۲۰۰۶ء

(۳۵) اجتہاد اور تقلید حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ، حجۃ الاسلام اکیڈمی، دار العلوم وقف دیوبند، ۱۴۳۵ھ